

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

یہی کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہی انسانیت کی نجات کا کلمہ ہے
لیکن یہ صرف ایک بول ہی نہیں ہے، بلکہ ایک شہادت، ایک اصول اور ایک اہم فیصلہ ہے، دراصل یہ
اس بات کا عہد ہے کہ ہم صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی بھیجی ہوئی
اور حضرت محمد صلعم کی لائی ہوئی ہدایت اور شریعت کی پیروی کریں گے اور اسی حال میں جئیں گے اور
جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لاچکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی ایمانی
زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں، ہم اس کا
عہد کرتے ہیں، اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ
تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ

"ادارہ الفرقان"

مسئول
محمد منظور نعمانی

مرتب
عتیق الرحمٰن سنبھلی

ماہنامہ

الفرقان لکھنؤ

ہندوستان و پاکستان سے
سالانہ چندہ (سکۂ پاکستان) ۶/-
سالانہ چندہ (سکۂ ہندوستان) ۵/-
ششماہی ۳/-

غیر ممالک سے
سالانہ چندہ ۱۰ شلنگ
اعزازی خریداروں سے
سالانہ ۱۵/-

(فی کاپی آٹھ آنے ۸)

جلد (۲۶) ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۸ھ مطابق دسمبر ۱۹۵۸ء شمارہ (۵)

نمبر شمار	مضامین	مضامین نگار	صفحہ

اگر اس دائرہ میں ◌ سرخ نشان ہو تو

اس کا مطلب یہ ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لیے سالانہ چندہ ارسال فرمائیں۔ یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، ورنہ اگلا رسالہ بصیغۂ وی، پی ارسال کیا جائے گا۔

چندہ یا کوئی دوسری اطلاع دفتر میں زیادہ سے زیادہ ۲۴ تاریخ تک پہونچ جانی چاہیے۔

پاکستان کے خریدار:- اپنا چندہ سکریٹری ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں، اور منی آرڈر کی پہلی رسید ہمارے پاس فوراً بھیجدیں۔

تاریخ اشاعت:- رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ کو روانہ کردیا جاتا ہے۔ اگر ۲۵ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں۔

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

کتب خانہ الفرقان کی مطبوعات

کلمۂ طیبہ کی حقیقت

از افادات مولانا نعمانی

اس میں اسلام کے کلمۂ دعوت "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ" کی تشریح پوری تحقیق کے ساتھ ایسے مؤثر انداز میں کی گئی ہے کہ سطر سطر سے ایمان ویقین میں اضافہ ہوتا ہے اور دماغ کے ساتھ دل بھی متاثر ہوتا ہے۔

قیمت ۔۔ -/۶/-

نماز کی حقیقت

از افادات مولانا نعمانی

ہر تعلیم یافتہ مسلمان کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ نماز کے مقام اور اس کی روح وحقیقت سے واقف ہونے کے لیے اس رسالہ کا مطالعہ ضرور فرمائیں "کلمۂ طیبہ کی حقیقت" کی طرح یہ بھی عقل و جذبات اور دل و دماغ کو یکساں متاثر کرتا ہے۔

قیمت......... -/۱۲/-

برکات رمضان

از افادات مولانا نعمانی

اسلام کے اہم رکن "صوم رمضان" اور ماہ رمضان اور اس کے خاص اعمال و وظائف، تراویح و اعتکاف وغیرہ کے فضائل و برکات، اور ان کی روحانی تاثرات کا نہایت مؤثر اور شوق انگیز بیان اور حکیم اُمت حضرت شاہ ولی اللہؒ کے طرز پر اس سلسلہ کی احادیث کی ایسی تشریح جس سے دل بھی متاثر ہو اور دماغ بھی مطمئن۔ قیمت -/۱۲/-

اسلام کیا ہے؟

تالیف مولانا نعمانی

اُردو اور ہندی دونوں زبانوں میں

اس کتاب کے دیکھنے والوں کا عام احساس یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کوئی خاص مقبولیت و تاثیر عطا فرمائی ہے، پچھلے چند سالوں میں تقریباً تیس ہزار اردو میں اور کئی ہزار گجراتی میں شائع ہو چکی ہے

اسلام کے متعلق ضروری واقفیت حاصل کرنے کے لیے ہی نہیں بلکہ کامل مسلمان اور اللہ کا ولی بننے کے لیے بھی اس کا مطالعہ اور عمل انشاء اللہ کافی ہے۔ زبان نہایت آسان ہونے کے ساتھ نہایت شیریں اور پُر تاثیر ہے۔ کتابت طباعت عمدہ اور معیاری قسم اول کاغذ ۲۰ پونڈ چکنا مجلد -/۲/۸ قسم دوم کاغذ ۲۲ پونڈ چکنا غیر مجلد -/۲/۱

ہندی اڈیشن کاغذ اعلیٰ مجلد، قیمت تین روپے -/-/۳

آپ حج کیسے کریں؟

حج و زیارت کے متعلق اردو زبان میں بے شمار چھوٹی بڑی کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن یہ کتاب (جو مولانا نعمانی اور مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی گویا مشترک تالیف ہے) اپنی اس خصوصیت میں اب بھی بے نظیر ہے کہ اس کے مطالعہ سے حج کا صحیح اور مسنون طریقہ بھی تفصیل سے معلوم ہو جاتا ہے اور دل میں عشق و جذب اور ذوق و شوق کی وہ کیفیات بھی پیدا ہو جاتی ہیں جو در اصل حج کی روح اور جان ہیں۔

کاغذ عمدہ......... قیمت مجلد -/-/۲

آسان حج

یہ آسان زبان میں "حج کیسے کریں" کا خلاصہ ہے۔ ایسے کم تعلیم والے حضرات جو صرف آسان اور معمولی اردو ہی پڑھ سکتے ہیں وہ اس کے مطالعہ سے پورا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

طباعت معیاری......... قیمت صرف -/۴/-

حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت

تالیف مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے قابل قدر فاضلانہ اور مبسوط مقدمہ .... -/۸/۲

ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ

مرتبہ۔ مولانا محمد منظور نعمانی۔ قیمت -/۸/۱

امام ولی اللہ دہلویؒ

از مولانا عبید اللہ سندھیؒ ...... قیمت -/-/۱

انیس نسواں

از محترمہ بیگم سید اصغر حسین صاحب

مسلمان خواتین خاص کر تعلیم یافتہ بہنوں میں دین کی طرف سے جو بے فکری اور آخرت کی طرف سے جو غفلت تیزی سے بڑھ رہی ہے اس کے علاج اور انسداد کے لیے ایک محترم بہن نے یہ رسالہ لکھا ہے۔ شروع میں مولانا نعمانی کے قلم سے پیش لفظ ہے۔...... قیمت -/۱۰/-

قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ

قیمت -/۶/-

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور معاندین کے الزامات

قیمت -/۸/۱

معرکۃ القلم

اکابر دیوبند کی طرف سے مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے سنگین تکفیری الزامات کا آخری تحقیقی جواب۔......... قیمت -/-/۱

ان افکار میں بڑی حد تک صداقت ہے۔ اور ان سب سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ

تہذیبی نظام کی درستی کے بغیر انسانیت کے مسائل اطمینان بخش طور پر حل نہیں ہو سکتے اور

تہذیبی نظام کی درستی ایک ایسے عقیدے کے بغیر نہیں ہو سکتی جس سے اخلاقی و روحانی پابندیوں کی کونپلیں پھوٹتی ہوں، اور ان مستقل قدار کا تعین ہوتا ہو جو انسانی زندگی کی دائمی رہنمائی کریں۔

یہ نتیجہ ہے جو اس سلسلۂ افکار سے برآمد ہوتا ہے، اور یہ بالکل حق ہے ـــــ اور غالباً ہنرو جی بھی ان مقدمات کی روشنی میں اس پر پہونچے ہوں گے ـــــ مگر سوال یہ ہے کہ اس قسم کا عقیدہ حاصل کیسے ہو؟۔

عقیدہ کسے کہتے ہیں؟ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کی کوشش اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتی جب تک ہم یہ نہ جانیں کہ عقیدہ کسے کہتے ہیں؟۔

عقیدہ نام ہے ماورائے محسوسات سے متعلق اس علم و خیال کا جو جزم و یقین بن کر قلب میں جاگزیں ہو جائے۔ عقیدے کی یہی خصوصیت ہے جس کی بنا پر انسان اُن پابندیوں کے احترام پر خود کو مجبور پاتا ہے جو کسی عقیدہ کا تقاضہ بن کر سامنے آتی ہیں، اسکے برخلاف اگر کسی علم و خیال میں قلبی یقین کی کیفیت نہ ہو تو وہ انسان کے سامنے اپنے تقاضے لا تو سکتا ہے مگر اُن کے احترام پر اس کو مجبور نہیں کر سکتا۔

عقیدے کی یہ تعریف اگر صحیح ہے تو تنہا اسی سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح ہوگا کہ عقیدہ فلسفہ سے نہیں، مذہب ہی کی بارگاہ سے حاصل ہو سکتا ہے، کیونکہ مذہب کا نزول وحی و الہام کے ذریعہ ایک قلب پر ہوتا ہے اور پھر اس قلب سے نکل کر باقی انسانوں کے قلوب ہی کو وہ براہ راست اپیل کرتا ہے، جبکہ فلسفہ عقل و نظر کی پیداوار ہے اور مجرد عقل و نظر کا ثمرہ دماغ کی حد تک جو کچھ بھی بن جائے، قلب کا یقین ہرگز نہیں بنا کرتا، جیسا کہ فطرت انسانی کا تجربہ گواہ ہے[۵]۔

---

[۵] مذہب اور فلسفہ کے اس فرق کی قدرے وضاحت یوں ہو سکتی ہے کہ فلسفہ فکر و نظر کے عمل کا نتیجہ ہے۔ اور فکر و نظر کا ہر نتیجہ اس امکان کی زد میں رہتا ہے کہ کوئی دوسرا نظری عمل اسے کسی وقت بھی رد کر دے۔ جیسا کہ فلاسفہ کا اختلاف اور اُن کی آراء کا ارتقاء اس پر شاہد ہے۔ مگر مذہب جو وحی و الہام کے خبری سرچشمہ سے برآمد ہوتا ہے۔ وہ چونکہ کسی نظری عمل کا رہین منت نہیں ہوتا اسلیے اس خطرہ سے باہر رہتا ہے جو فلسفہ کا لازمہ ہے۔ بلکہ وہ جس قلب پر اولاً نزول کرتا ہے دنیا کی سب سے بڑی صداقت بن کر نزول کرتا ہے، اور اس یقین اور عندیت کے ساتھ اس "خبر" کو اٹھانے والا قلب جب دوسروں تک اس کو پہنچاتا ہے تو قبول کرنے والے اس "خبر" کو اسی یقین کے ساتھ قبول کرتے ہیں کہ یہ دنیا کی صادق ترین خبر ہے۔ غرض مذہب اور فلسفہ کا اصلی فرق دونوں کے سرچشموں کا فرق ہے۔ مذہب کا سرچشمہ طبعاً ہے ہی ایسا کہ اسکے ثمرات کو قبول کرنے کے ساتھ یقین و اعتماد کی کیفیت لازم ہے۔ برخلاف فلسفہ کے سرچشمہ کے کہ اس کے ساتھ ارتیاب و تردد بالفعل نہیں تو بالقوہ ضرور لازم ہے۔ ۱۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

نگاہِ اوّلیں

نہرو جی کے مضمون کے جو چند اقتباسات ہم نے ان صفحات میں پیش کیے تھے اُن میں حسب ذیل افکار نظر آتے ہیں۔

۱۔ ہمارے مسائل بنیادی طور پر ہماری تہذیب کے مسائل ہیں۔

۲۔ تہذیبی صحت مندی و توانائی اور چیز ہے، سائنسی ترقی اور چیز! اول کا تعلق انسان کے اندرون سے ہے جبکہ ثانی بالکل باہر کی چیز ہے۔

۳۔ تہذیبی صحت مندی و توانائی ضبط نفس اور اخلاقی و روحانی پابندیوں پر موقوف ہے۔

۴۔ اخلاقی و روحانی پابندیوں کا جو سلسلہ سماج میں قائم تھا وہ اسلیے ختم ہوتا جا رہا ہے کہ وہ "مذہب" سے وابستہ تھا۔ اور عقلیت پسندی کا جو رجحان آج پھیل گیا ہے وہ مذہب کو دور از کار یا از کار رفتہ باور کر دکر رہا ہے اس لیے "مذہب" کے ساتھ اس کے ثمرات بھی رخصت ہوئے۔

۵۔ "مذہب" اگر اوہام پرست اور دور از کار باتوں کا مجموعہ تھا تو عقلیت پسندی کو کسی نامعلوم وجہ سے سطح بینی اور بہ ظاہر گرفتاری کا عارضہ ہے۔ پس عقل کے ماتحت بھی جو فیصلے اور اقدامات کیے جا رہے ہیں وہ مسائل کی اصل حقیقت سے بے خبری کے ساتھ ہیں۔ ــــــ یہی وجہ ہے کہ عقلیت پسندی کے ماتحت جو نئی تہذیب وجود میں آئی تھی وہ ناکارہ ثابت ہو رہی ہے۔

۶۔ محض ضابطہ اور محض کوئی عقیدہ انسانی زندگی کو اطمینان وسکون ــــــ جو نتیجہ ہوتا ہے تہذیبی صحت و توانائی کا ــــــ نہیں بخش سکتا۔ ضابطہ اور عقیدہ ایسا ہونا چاہیے جس میں اخلاقی اور روحانی پہلو بھی ہو، اسلیے کہ یہ انسانی فطرت کا ایک لازمی تقاضہ ہے۔

۷۔ انسانی زندگی کے روحانی اور اخلاقی پہلو کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو پھر کوئی مستقل قدر اور انسانی عادات و اطوار کی برائی بھلائی کا کوئی دائمی پیمانہ نہیں رہ جاتا ــــــ جو تہذیبی صحت و توانائی کی اولین ضرورت ہے۔

التذکیر بالقرآن

(از حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب مدظلہم العالی)

۳

آخر میں جی چاہتا ہے کہ علم اور علماء کی فضیلت سے متعلق بخاری شریف کا ایک ترجمۃ الباب اور فتح الباری سے اس کے بعض حصص کی شرح لکھ دوں جو مضمون ہذا سے غیر مربوط بھی نہیں ہے اس لیے اس کا بیان بے محل نہ ہوگا۔ وہو ہذا۔

باب العلم قبل القول والعمل	باب اس میں کہ علم قول اور عمل سے پہلے
لقول اللہ تعالیٰ فاعلم انہ لا	ہوتا ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا
إلہ الا اللہ فبدأ بالعلم وان	ہے کہ فاعلم انہ لا الہ الا اللہ اور
العلماء هم ورثة الانبياء	اس میں ابتدا علم ہی سے فرمائی ہے
ورّثوا العلم من اخذه اخذ بحظ	اور یہ کہ علماء ہی انبیاء کے وارث
وافر ومن سلك طريقا يطلب	ہیں اور یہ کہ انبیاء علم ہی کا وارث
به علما سهل الله له طريقا	بناتے ہیں سو جس شخص نے اس کو لیا اس
الى الجنة۔ وقال جل ذكره	نے بڑا حصہ پایا، اور یہ کہ جو شخص کسی
انما يخشى الله من عباده العلمآء	ایسے راستے پر چلا جس کے ذریعہ علم طلب
وقال ما يعقلها الا العالمون	کرنا چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے
وقالوا لو كنا نسمع او نعقل ما	جنت کا راستہ سہل فرما دیں گے، اور اللہ
كنا فى اصحاب السعير وقال هل	تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اللہ کے بندوں میں

بہرحال ہم تو جہاں تک غور کرتے ہیں یہی پاتے ہیں کہ نفس عقیدہ ہی مذہب کے سوا کہیں اور سے نہیں مل سکتا۔ لیکن اگر کسی کے نزدیک یہ ضروری نہ ہو تب بھی جس قسم کے عقیدے کے سرچشمے کی ہمیں تلاش ہو اس کے پیش نظر تو یہ ماننا ہی پڑے گا کہ اس کا واحد سرچشمہ مذہب ہی ہو سکتا ہے۔ اور اس کا سب سے بڑا ثبوت خود یہ صورت حال ہے جس کا اعتراف پنڈت جی کو بھی ہے۔ کہ مذہب کا "طلسم" ٹوٹنے کے ساتھ ساتھ اخلاقی اور روحانی پابندیاں بھی ختم ہو رہی ہیں۔ علاوہ ازیں خالص نظری انداز پر بھی ہم یہ بات سمجھ سکتے ہیں کہ اس کائنات کی ابتدار و انتہا اور اس میں اپنے مقام کے بارے میں جو جوابات ہمیں مذہب سے ملتے ہیں صرف وہی کسی انسان کے اندر اخلاقی اور روحانی احساسات کو بیدار کر سکتے ہیں۔ ورنہ عقلیت تو ہمیں صرف افادی اخلاق کا سبق پڑھا سکتی ہے۔ اور روحانیت ایک لفظ بے معنیٰ ہے، اگر انسان کا رشتہ ایک خالق و مالک سے نہ قائم ہو۔

بہرحال یہ تو طے ہو کہ مذہب ہی ہمیں ایسے عقائد بخش سکتا ہے، جو انسان کی اپنی خوشی سے اس پر روحانی اور اخلاقی پابندیاں عائد کریں، اب رہا یہ مسئلہ کہ" مذہب عملی شکل میں یا تو ان معاملات سے تعلق رکھتا ہے جو ہماری عام زندگیوں سے علاقہ نہیں رکھتے۔ یا ایسی رسوم و روایات سے بندھا ہوا ہے جو موجودہ دور سے مطابقت نہیں رکھتیں"۔ تو ہمارا خیال ہو کہ پنڈت جی نے اپنے گرد و پیش کے مذہب کو دیکھ کر جنس مذہب کے بارے میں یہ رائے قائم کرلی ہے۔ ورنہ کم از کم ایک مذہب ــــ اسلام ــــ کے بارے میں تو ہم علیٰ وجہ البصیرت کہہ سکتے ہیں کہ اس پر یہ تجزیہ صادق نہیں آتا، اگر پنڈت جی نے اس کا کما حقہ، مطالعہ کیا ہے اور اُس کے بعد بھی اُن کی یہی رائے ہے تو ہم چاہیں گے کہ پنڈت جی اُن چیزوں کی کچھ نشان دہی فرمائیں جو وہ اسلام میں اس تجزیے کے مطابق پاتے ہیں۔ ہو سکتا ہو کہ ایک کارآمد مذہب کسی غلط فہمی کی وجہ سے انھیں بے کار نظر آرہا ہو، اور اس غلط فہمی کے ازالہ کے بعد انھیں اس مسئلہ کا حل مل جائے جس کی خاطر وہ اپنے مضمون (بنیادی رویہ) میں بے حد پریشان نظر آتے ہیں۔

اھل العلم فالمعنی لوکنا من اھل العلم لعلمنا ما یجب علینا فعملنا بہ فنجونا۔ (فتح الباری ص ۱۱ ج ۱) جو بیان کی جاتی ہیں "کاش کہ ہم سنتے" یعنی سُن کر بات کو اسکو سمجھنے اور محفوظ رکھنے والوں کا سا سننا سنتے۔ اور یہ جو فرمایا کہ "کاش ہم سمجھتے" یعنی سمجھنا اس شخص جیسا جو اشیا کے نیک و بد کی تمیز بھی کرتا ہو۔ اور یہ دونوں چونکہ اہل علم کے اوصاف میں سے ہیں لہذا مطلب یہ ہوا کہ کاش ہم بھی اہل علم میں سے ہوتے تو اپنے ذمہ جو امور واجبہ تھے ان کو جانتے اور عمل کرتے تاکہ نجات پاتے۔

حضرت بخاریؒ نے تو یہاں صرف سورۂ ملک کی ایک ہی آیت لی ہے۔

وقالوا لوکنا نسمع او نعقل ما کنا فی اصحاب السعیر۔ یعنی اور کہیں گے کہ اگر ہم سنتے اور سمجھتے تو ہم اہل دوزخ میں نہ ہوتے۔

لیکن اس کے آگے فرماتے ہیں کہ:

فاعترفوا بذنبھم فسحقا لاصحاب السعیر۔ یعنی غرض اپنے جرم کا اقرار کریں گے سو اہل دوزخ پر لعنت ہے۔

ان میں دوزخیوں کا بیان ہو کہ دوزخ میں جا کر اقرار کریں گے کہ دنیا میں ہم نے سماع قبول نہیں کیا تھا اور عقل و فہم سے کام نہیں لیا تھا، اور اب یہاں اپنے گناہوں کا اعتراف کریں گے اور وہاں اپنے کیے پر نادم ہوں گے۔ حیث لا ینفعھم الندم۔

اس کے بعد والی آیت میں مومنین کا بیان ہے کہ۔

ان الذین یخشون ربھم بالغیب لھم مغفرۃ واجر کبیر۔ یعنی بے شک جو لوگ اپنے پروردگار سے بے دیکھے ڈرتے ہیں ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم ہے۔

اس میں ان کی جزا یعنی مغفرت اور اجر کبیر کو ان کی دنیاوی خشیت پر مرتب فرمایا ہے یعنی آخرت میں ان کو مغفرت اور اجر کبیر اس لیے ملے گا کہ وہ دنیا میں خشیت خداوندی کے ساتھ متصف تھے۔ یہ تو فریقین کا الگ الگ حال بیان ہوا۔ یہاں سے میں یہ کہتا ہوں کہ قرینۂ تقابل سے معلوم ہوا کہ کفار نے جس طرح سے دنیا میں سمع اور عقل سے کام نہیں لیا تھا، اسی طرح ان کو دنیا میں

يستوي الذين يعلمون والذين
لا يعلمون وقال النبي صلى الله
عليه وسلم من يرد الله به خيراً
يفقهه في الدين وانما العلم
بالتعلم الخ
(بخاری شریف ج ۱)

سے علما ہی اس سے خشیت رکھتے ہیں
۔ اور فرمایا کہ ان کو نہیں سمجھ سکتے مگر
علماء۔ اور فرمایا کہ یہ کفار کہیں گے کہ
اگر ہم سنتے یا سمجھتے تو ہم اہل دوزخ
میں نہ ہوتے، نیز فرمایا کہ کیا برابر ہیں
وہ لوگ جو جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے۔

اور فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کو دین میں تفقہ مرحمت فرما دیتے ہیں۔ اور علم تو تعلم یعنی سیکھنے ہی سے حاصل ہوتا ہے“ ——— (آگے فتح الباری سے اسکی تشریح ملاحظہ فرمائی جائے)

(قوله باب العلم قبل القول و
العمل) قال ابن المنير اراد به
ان العلم شرط في صحة القول
والعمل ولا يعتبران الا به فهو
متقدم عليهما لانه مصحح للنية
المصححة للعمل فنبه المصنف
على ذلك حتى لا يسبق الى الذهن
من قولهم ان العلم لا ينفع الا بالعمل
تهوين امر العلم والتساهل في
طلبه.

مصنفؒ نے یہ جو فرمایا کہ علم کا درجہ
قول اور عمل سے پہلے ہے تو ابن منیرؒ
فرماتے ہیں کہ بخاریؒ کی مراد اس سے
یہ ہے کہ قول اور عمل کی صحت کے لیے علم
شرط ہے۔ یعنی یہ دونوں بدون اس کے
معتبر ہی نہیں ہیں لہذا علم ان دونوں سے
مقدم ہوا اسلئے کہ وہی نیت کو صحیح کرنے
والا ہے جو کہ عمل کو درست کرنے والی ہو۔
پس مصنفؒ نے اس پر اس لیے تنبیہ فرمائی
کہ مبادا لوگوں کے اس مقولے سے کہ علم بدون
عمل کے نافع ہی نہیں ہوتا، علم کی ناقدری
یا اسکے طلب میں سستی کا خیال کسی کے
ذہن میں راہ نہ پا جائے۔

(قوله وما يعقلها) اي الامثال
المضروبة (قوله لو كنا نسمع) اي
سمع من يعي ويفهم (قوله او نعقل)
عقل من يميز وهذه اوصاف

اور نہیں سمجھتے ان کو یعنی ان امثال کو

نظر بہ ثواب آخرت ان سب کے ذکر کی حیثیت تو ترغیب کی سی ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب بعض امور بطور ترہیب کے بھی بیان کر دیے جائیں تاکہ ترغیب اور ترہیب دونوں کے مجموعہ سے تاثر قوی پیدا ہو کہ یہی مقصود بیان ہے۔

اس سلسلہ میں ترمذی شریف کے ابواب الزہد کی ایک روایت نقل کرتا ہوں۔

حدثنا سويد بن نصر قال حدثنا	حدیث بیان کی ہم سے سوید بن نصر نے کہا
عبد الله بن المبارك نا حيوة	حدیث بیان فرمائی ہم سے عبد اللہ بن مبارک
بن شريح نا الوليد بن ابي الوليد	نے انھوں نے فرمایا کہ حدیث بیان کی ہم سے
ابو عثمان المدائني ان عقبة بن	شریح نے انھوں نے فرمایا کہ ہم سے بیان
مسلم حدثه انه دخل المدينة	کیا ولید بن ابی الولید ابو عثمان مدائنی نے
فاذا هو برجل قد اجتمع عليه	کہ عقبہ بن مسلم نے ان سے بیان کیا کہ جب وہ
الناس فقال من هذا فقالوا	مدینہ میں داخل ہوئے تو وہاں دیکھا کہ ایک
ابو هريرة ! فدنوت منه حتى	بزرگ بیٹھے ہیں اور ان کے ارد گرد لوگوں کا
قعدت بين يديه وهو يحدث	ایک مجمع ہے۔ حضرت عقبہ بن مسلم نے دریافت
الناس فلما سكت وخلا قلت له	کیا کہ یہ کون صاحب ہیں؟ لوگوں نے بتایا
اسألك بحق وبحق لما حدثتني	کہ یہ حضرت ابو ہریرہ رضؓ ہیں۔ (کہتے ہیں کہ)
حديثاً سمعته من رسول الله	پھر میں ان کے قریب گیا وہ لوگوں سے
صلى الله عليه وسلم عقلته و	حدیث بیان فرما رہے تھے۔ میں بھی ان کے
علمته فقال ابو هريرة افعل	سامنے جا کر بیٹھ گیا جب وہ خاموش ہوئے
لاحدثنك حديثاً حدثنيه رسول	اور تنہا رہ گئے تو میں نے عرض کیا کہ آپ سے
الله صلى الله عليه وسلم عقلته	حق کے واسطہ سے اور پھر حق کے واسطہ
وعلمته ثم نشغ ابو هريرة نشغة	یہ درخواست کرتا ہوں کہ آپ مجھ سے ضرور
فمكث قليلاً ثم افاق فقال لا	بالضرور ایک ایسی حدیث بیان فرمائیں جسکو
حدثنك حديثاً حدثنيه رسول	آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہو

خشیت بھی نہ تھی اور اسی کے نہ ہونے کی وجہ سے اعتراف بالذنب بھی ان کو نہ تھا، اور مومن کو چونکہ دنیا میں خشیت حاصل ہوتی ہے اس لیے وہ اس کے مقدمات یعنی سمع و عقل سے بھی متصف ہوتے ہیں اور ان کو دنیا ہی میں اعتراف بالذنب بھی حاصل ہوتا ہے۔

اب ان دونوں آیتوں کو ملانے سے مومن کامل کے اوصاف معلوم ہوئے کہ سمع و عقل، خشیت اور اعتراف بالذنب یہ سب مومن کی صفات ہیں۔

اسی طرح سے ایک اور جگہ اہل دنیا اور اہل علم کے اوصاف کا ذکر اس طرح سے فرمایا ہے۔ سورۂ قصص میں قارون کے ذکر میں فرماتے ہیں کہ:۔

فخرج علیٰ قومه فی زینته ؕ	پھر وہ اپنی آرائش سے اپنی برادری کے
قال الذین یریدون الحیوٰة	سامنے نکلا۔ جو لوگ دنیا کے طالب تھے کہنے
الدنیا یٰلیت لنا مثل ما اوتی	لگے کیا خوب ہوتا کہ ہم کو بھی وہ ساز و سامان
قارون انه لذو حظٍ عظیم ○	ملا ہوتا جیسا قارون کو ملا ہو۔ واقعی وہ بڑا صاحب
(سورۂ قصص)	نصیب ہو۔ (بیان القرآن)

یہ تو دنیا داروں کا قول نقل فرمایا جس سے ان کا وصف معلوم ہوا کہ دوسرے کی نعمت عاجلہ دیکھ کر ریجھ پڑتے ہیں۔ اور اس کے بعد اہل علم کا جواب نقل فرماتے ہیں سنئے۔ فرماتے ہیں:

وقال الذین اوتوا العلم ویلکم	اور جن کو فہم عطا ہوئی تھی وہ کہنے لگے، ارے
ثواب الله خیر لمن آمن وعمل	تمہارا ناس ہو اللہ تعالیٰ کے گھر کا ثواب ہزار درجہ
صالحا ولا یلقٰها الا الصابرون ○	بہتر ہو جو ایسے شخص کو ملتا ہو کہ ایمان لائے اور نیک
(سورۂ قصص)	عمل کرے اور وہ ان ہی کو دیا جاتا ہے
	جو صبر کرنے والے ہیں (بیان القرآن)

اس سے معلوم ہوا کہ اہل علم کی یہ شان ہے کہ ہر وقت ان کی نظر اللہ تعالیٰ کے ثواب پر اور آخرت پر ہوتی ہے۔ یہ بھی عالم کا ایک مخصوص وصف ہے۔

عالم کے جن اوصاف کا بیان تک ذکر ہوا یعنی سماع، عقل، خشیت، اعتراف بذنبہم، اور

الليل وآناء النهار فيقول الله
له كذبت وتقول الملائكة
له كذبت ويقول الله له بل
اردت ان يقال فلان قارئ*
ويؤتى لصاحب المال
فيقول الله له الم اوسع عليك حتى لم ادعك
تحتاج الى احد قال بلى يا رب
قال فماذا عملت فيما آتيتك
قال كنت اصل الرحم واتصدق
فيقول الله له كذبت وتقول
الملائكة كذبت ويقول الله
بل اردت ان يقال فلان
جواد وقد قيل ذالك *
ويؤتى بالذي قتل في
سبيل الله فيقول الله له فيما
ذا قتلت فيقول امرت بالجهاد
في سبيلك فقاتلت حتى قتلت
فيقول الله له كذبت وتقول
الملائكة كذبت ويقول الله بل
اردت ان يقال فلان جريئ
فقد قيل ذلك۔
ثم ضرب رسول الله صلى
الله عليه وسلم على ركبتي فقال

قیامت جب اللہ تبارک وتعالیٰ بندوں کا
فیصلہ فرمانے کے لیے نزول فرمائیں گے اور
سب لوگ زانو کے بل پڑے ہوں گے
تو سب سے پہلے جن کو بلایا جائے گا (وہ تین قسم
کے لوگ ہوں گے) ایک تو وہ ہوگا جو قاری
یعنی عالم بالقرآن ہوگا۔ دوسرا وہ ہوگا جس نے
اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کیا ہوگا۔ اور
تیسرا وہ شخص ہوگا جو دنیا میں مالدار ہوگا۔ پس
اللہ تعالیٰ اس عالم قرآن سے سوال فرمائیں
گے کہ کیا میں نے تجھ کو اس کتاب کا عالم
نہیں بنایا تھا جو میں نے اپنے رسول پر نازل
فرمایا تھا؟ وہ کہے گا کہ بے شک اے میرے
پروردگار ایسا ہی تھا، ارشاد ہوگا کہ پھر
تو نے اپنے علم پر کیا عمل کیا؟ کہے گا میں اس کی
رات اور دن کی گھڑیوں میں تلاوت کرتا تھا
اللہ تعالیٰ اس سے فرمائیں گے کہ تو جھوٹا ہے
اور فرشتے بھی اس سے کہیں گے کہ تو جھوٹا ہے۔
اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ یہ بات نہیں ہے بلکہ تو
یہ چاہتا تھا کہ تجھ کو قاری اور عالم کہہ کر پکارا
جائے (سو دنیا میں تو کہا جا چکا)
اسی طرح صاحب مال لایا جائے گا۔ اللہ
تعالیٰ اس سے بھی فرمائیں گے کہ کیا میں نے
تجھ پر وسعت نہیں کی تھی؟ یہاں تک کہ دنیا

اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی ھذا
البیت ما معنا احد غیری
وغیرہ ثم نشغ ابوھریرۃ
نشغۃً شدیدۃً ثم افاق
ومسح وجھہ وقال افعل
لاحدثنک حدیثاً حدثنیہ
رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و
سلم انا وھو فی ھذا البیت ما
معنا احد غیری وغیرہ ثم
نشغ نشغۃً شدیدۃً ثم مال
خارّاً علی وجھہ فاسندتہ
طویلاً ثم افاق فقال ثنی
رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم
ان اللّٰہ تعالیٰ اذا کان یوم
القیٰمۃ ینزل الی العباد
لیقضی بینھم وکل امۃ جاثیۃ
فاول من یدعو بہ رجل جمع
القرآن ورجل قتل فی سبیل
اللّٰہ ورجل کثیر المال فیقول
اللّٰہ للقاری الم اعلمک ما
انزلت علیٰ رسولی قال بلیٰ
یارب قال فماذا عملت فیما
علمت قال کنت اقوم بہ اناء

اور سمجھا ہو اور سیکھا ہو۔ حضرت ابوہریرہؓ نے
فرمایا (میں ایسا کروں گا اور تم سے ضرور ایسی
ہی حدیث بیان کروں گا جو مجھ سے رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہو۔
اور میں نے اسے سیکھا اور سمجھا ہے۔
یہ کہہ کر ابوہریرہ بیہوش ہو گئے اور تھوڑی
دیر کے بعد جب افاقہ ہوا تو پھر فرمایا کہ میں تم
سے ایسی ہی حدیث بیان کروں گا جو مجھ سے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حجرہ میں
بیان فرمائی تھی کہ میں تھا اور حضورؐ تھے اور
ہمارے علاوہ کوئی تیسرا نہ تھا یہ کہا اور پھر
(دوبارہ) سخت بیہوش ہو گئے۔ پھر جب ہوش
آیا تو اپنا چہرہ وغیرہ صاف کر کے فرمایا کہ
میں یہ کام کروں گا یعنی تم سے ایسی حدیث
ضرور بیان کروں گا جس کو مجھ سے رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا تھا در آں
حالیکہ میں اور آپؐ اسی گھر میں تھے، اور
ہمارے ساتھ کوئی اور نہ تھا، (تیسری بار)
پھر سخت دورہ غشی کا پڑا اور منھ کے بل
گرنے لگے تو میں نے اپنی گود میں آپ کو
ٹیک لیا۔ پھر جب بہت دیر کے بعد افاقہ ہوا
تو پھر ارشاد فرمایا کہ حدیث بیان فرمائی مجھ
سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ بروز

حدیثٌ حسنٌ غریبٌ * (ترمذی شریف ج ۲)

پر ہاتھ مار کر فرمایا کہ اے ابو ہریرہ یہی ہیں وہ تین شخص کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سب سے پہلے جہنم میں یہی لوگ ڈالے جائیں گے۔ اور دوزخ انھیں سے روشن کی جائے گی۔

حضرت ولید ابو عثمان مدائنی کہتے ہیں کہ مجھ کو عقبہ نے یہ خبر دی کہ شفیا ہی وہ شخص ہیں جو کہ حضرت امیر معاویہؓ کے پاس گئے اور ان کو اس حدیث کی خبر دی۔

ابو عثمان کہتے ہیں کہ علا ابن ابی حکیم نے یہ بھی فرمایا کہ وہ حضرت معاویہ کے سیاف تھے تو جب وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان کو اس حدیث کی خبر دی کہ ابو ہریرہؓ ایسا ایسا بیان فرماتے ہیں۔ تو حضرت معاویہ نے فرمایا کہ ان مذکورہ اشخاص کے ساتھ تو یہ معاملہ ہوگا پھر ان کے علاوہ اور جو لوگ ہوں گے ان کا کیا حشر ہوگا؟ یہ کہہ کر حضرت معاویہ بہت روئے یہاں تک کہ ہم لوگوں نے تو یہ سمجھا کہ ان کی جان ہی نکل جائے گی اور ہم نے یہ منظر دیکھ کر کہا کہ کہاں سے یہ برا شخص یہ خبر لایا۔ جب پھر حضرت معاویہ کو افاقہ ہوا تو انھوں نے اپنا چہرہ وغیرہ صاف کیا اور فرمایا کہ سچ فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول نے۔ (اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے) جو شخص محض حیات دنیوی اور اس کی رونق چاہتا ہے تو ہم ان لوگوں کے اعمال ان کو دنیا ہی میں پورے طور پر بھگتا دیتے ہیں اور ان کے لیے دنیا میں کچھ کمی نہیں ہوتی۔ یہ ایسے لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں بجز دوزخ کے اور کچھ نہیں اور انھوں نے جو کچھ کیا تھا وہ آخرت میں سب ناکارہ ہوگا اور جو کچھ کر رہے ہیں وہ بے اثر ہے۔ (یہ حدیث حسن غریب ہے)

نیز ابن ماجہ کی ایک حدیث ہے کہ:۔

عن جابر بن عبد اللہؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا تعلموا العلم لتباهوا به العلماء ولا لتماروا به السفهاء ولا تخيروا المجالس فمن فعل ذلك فالنار النار *

حضرت جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ علم اس لیے نہ سیکھو کہ اس کے ذریعہ سے علماء پر بڑائی چاہو اور نہ اس لیے کہ اس کے ذریعہ سے بے وقوفوں سے جھگڑا کیا کرو اور نہ اس لیے کہ مجلس میں اس کی وجہ سے صدر مقام حاصل

يا اباهريرة اولئك الثلاثة
اول خلق الله تسعر بهم النار
يوم القيامة ٭

قال الوليد ابو عثمان المدائني
فاخبرني عقبة ان شفيّا هو الذي
دخل على معاوية فاخبره بهذا
قال ابو عثمان وحدثني العلاء
ابن ابي حكيم انه كان سيافا
لمعاوية قال فدخل عليه
فاخبره بهذا عن ابي هريرة
فقال معاوية قد فعل بهؤلاء
هذا فكيف بمن بقي من الناس
ثم بكى معاوية بكاءً شديداً
حتى ظننا انه هالك وقلنا
قد جاءنا هذا الرجل بشرّ ثم
افاق معاوية ومسح عن وجهه
وقال صدق الله ورسوله
من كان يريد الحيوٰة الدنيا
وزينتها نوف اليهم اعمالهم فيها
وهم فيها لا يبخسون اولئك
الذين ليس لهم في الآخرة الا
النار وحبط ما صنعوا فيها و
باطل ما كانوا يعملون. هذا

میں تجھ کو کسی کا محتاج نہیں رکھا تھا۔
وہ کہے گا کہ بیشک اے میرے پروردگار
ایسا ہی تھا، فرمائیں گے کہ پھر میری اس نعمت
کو پاکر تو نے کیا عمل کیا؟ وہ کہے گا کہ میں صلہ
رحمی کرتا تھا۔ صدقہ وخیرات دیتا تھا۔ اللہ
تعالیٰ یہ سن کر فرمائیں گے کہ تو جھوٹا ہے، اور
فرشتے بھی کہیں گے کہ تو جھوٹا ہے اور اللہ تعالےٰ
فرمائیں گے کہ یہ بات نہیں تھی بلکہ تو نے یہ سب
اس لیے کیا تھا کہ کہا جائے کہ فلاں شخص بڑا
سخی ہے سو دنیا میں یہ کہا جا چکا۔

پھر شہید کو پیش کیا جائے گا اور اللہ
تعالیٰ فرمائیں گے تو کیوں اور کس سلسلہ میں
مارا گیا۔ وہ عرض کرے گا یا رب آپ نے اپنی
راہ میں جہاد کا حکم فرمایا تھا اس لیے میں نے
قتال کیا۔ یہاں تک کہ تیری راہ میں کام آگیا۔
اللہ تعالیٰ فرمائیں گے تو جھوٹا ہے، اور
فرشتے بھی کہیں گے کہ تو جھوٹا ہے۔ اللہ تعالیٰ
فرمائیں گے کہ یہ بات نہیں ہے بلکہ تو نے
اس لیے قتال کیا تھا کہ لوگ کہیں کہ فلاں
شخص بڑا جری اور بہادر ہے۔ چنانچہ تیرے
متعلق یہ خوب کہا جا چکا۔

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ پھر
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے زانو

"آزادی کی کہانی"

نقد و نظر کی کسوٹی پر

(از:۔ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی)

[جناب مولانا نسیم احمد صاحب فریدی سے ناظرین الفرقان واقف ہیں، انھیں مسلمانان ہند کی دینی اور روحانی تاریخ سے خاص شغف اور دلچسپی ہے۔ الفرقان کے پچھلے بیس سالہ فائلوں میں ان کے قلم سے بزرگوں کے کتنے ہی تراجم و تذکرے اور ان کے ملفوظات و مکتوبات کے ترجمے نکل چکے ہیں جو ان کے اسی شغف کا عملی ثبوت ہیں۔ پھر ان کے اس شغف کو سلسلۂ مجددی اور خانوادۂ ولی اللّٰہی کے بارے میں کچھ اور بھی خصوصیت کا درجہ حاصل ہے ــــ اور ہندوستان کے طول و عرض میں، اہل حق کی راہ کو عزیز رکھنے والا کون مسلمان ہے جو ان ہر دو خانوادوں کی ممنونیت کا احساس اپنے اندر نہ پاتا ہو؟ ــــ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ "مولانا آزاد کی کہانی" (بروایت مولانا عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی) جب ان کے سامنے آئی، جس میں "مولانا آزاد کی زبانی" اُن کے والد ماجد کی طرف سے خانوادۂ ولی اللّٰہی کے پاک و شفاف دامن پر بہت سے داغ دھبے لگائے گئے ہیں۔ اور مولانا کے والد کے نانا کو اس خاندان کا شاگرد بتاتے ہوئے، اس کے مسلکِ حق کا سرگرم مخالف دکھایا گیا ہے۔ پھر یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ یہ دونوں حضرات گویا (اپنے دور میں) یکتائے روزگار اور مرجع انام تھے تو مولانا نسیم احمد صاحب نے اِن کے حالات و واقعات (مندرجہ "کہانی") کی تحقیق کا ارادہ کیا اور اسکے نتیجہ میں یہ مفصل تبصرہ تیار ہو گیا جو ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے:۔

(ابن ماجہ باب الانتفاع بالعلم والعمل)　　کرو۔ پس جس شخص نے ایسا کیا وہ جہنم سے
(ب ۲۳)　　ڈرے اور دوزخ کا خوف کرے۔

قولہ ولا تخیّزوا کے تحت حاشیہ میں حضرت مولانا شاہ عبد الغنی صاحب محدث دہلوی رح نے نقل فرمایا ہے کہ

والتحیز التمکن والتقرر المراد منہ	تحیّز کے معنی تمکن اور تقرر کے ہیں۔ مطلب یہ ہے
لا تمکنوا فی قلوب الناس لتکونوا	کہ علم سے یہ نہ مقصود ہو کہ لوگوں کے دل میں جگہ
صدراً للمجالس فانہ من اشد	حاصل کر و تاکہ ہر جگہ صدر مقام ہی پر بٹھائے
اغراض الدنیا لان آخر ما یخرج	جاؤ۔ (اور یہ اس لیے برا ہو کہ) یہ چیز اغراض
من قلوب الصدیقین حب الجاہ	دنیویہ میں سب سے سخت ترین ہو کیونکہ صدیقین
وھذہ عقبۃ کئودۃ للعلماء لا	کے قلوب سے آخر میں جو شے نکلتی ہو وہ
ینجو منہ الا المخلصون۔ انتہیٰ	حب جاہ ہی ہو۔ اور علماء کے لیے یہ ایک سخت
(حاشیہ ابن ماجہ شریف)	اور دشوار گذار گھاٹی ہو جس سے مخلصین

ہی نجات پاتے ہیں۔

دیکھئے ترمذی شریف کی اس حدیث میں اور ابن ماجہ شریف کی اس حدیث اور اس کی شرح میں جو حاشیہ پر ہے کس قدر مؤثر ترھیب ہو علماء کے لیے کہ اگر آج اسی قسم کی احادیث ہمارے پیش نظر ہو جائیں تو اخلاص پیدا کرنے کے لیے یہی اتنا کافی ہے۔ اہل علم کے ایک مجمع میں یہ بات آئی کہ آج علماء میں جو غفلت ہو اس کا سبب ان کا پڑھنا پڑھانا ہو۔ چنانچہ جو لوگ یہ کام کرتے ہیں ان میں غفلت ہو جاتی ہو۔ پھر کسی نے کہا کہ بھائی حدیث کی کتابوں میں کتاب الرقاق اور کتاب الزہد بھی تو ہو (جن میں ایسی ایسی روایات بھی ہیں جو اوپر مذکور ہوئیں) پس غفلت کا سبب تعلیم و تعلم نہیں ہے بلکہ ان ابواب کا پیش نظر نہ ہونا ہے۔ لہذا ضرورت ہے کہ آج علماء ان ابواب کو اور اس قسم کی روایات کو پیش نظر رکھیں اس سے غفلت زائل ہو گی۔ بس اسی پر مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق بخشے۔

والسلام

کی مملکت کے فرماں روا ہے۔ اور چار دانگ عالم میں اُن کے علمی کمالات کی شہرت ہوئی ــــــ لیکن ان کے مفصّل اور مکمل سوانح حیات نہ تو اُن کے قلم سے اُن کی حیات میں شائع ہوئے اور نہ کسی اور ہی نے ابتک یہ کام انجام دیا۔

البتہ ان کی وفات کے معاً بعد مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے جس کے متعلق ان کا بیان ہے کہ آج سے ۳۷ سال پہلے ۱۹۲۱ء میں جب مولانا نظر بند کئے گئے اور ملیح آبادی صاحب کو بھی اُن کی رفاقت میسر آئی تو جیل کی اس فرصت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھوں نے مولانا سے خواہش کی کہ وہ اپنے حالات قلمبند کرادیں، اور پھر مولانا جو کچھ املا کراتے گئے یہ اس کو لکھتے گئے۔ اس طرح ایک نامکمل "سوانح عمری" انھوں نے مرتب کرلی جیسا کہ کتاب کے دیباچہ میں ملیح آبادی صاحب لکھتے ہیں:۔

"آزاد کی کہانی کی شان ...... یہ ہے کہ ۱۹۲۱ء میں ہم سب جیل کے چرند پرند بن چکے تھے۔ جیل کی عجیب زندگی کو وہی سمجھ سکتے ہیں جو جیل میں رہ چکے ہیں ....

.... میں نے مولانا کو اُکسانا شروع کیا کہ تذکرہ کی دوسری جلد لکھا دیں ــــ ہفتوں میرے بھائی میرے بھائی کہہ کر ٹالتے رہے مگر میں بھی بھلا پیچھا چھوڑنے والا ــــ تقاضا جاری رکھا، آخر راضی ہوگئے اور کتاب لکھانا شروع کردی، بولتے جاتے تھے اور میں پنسل سے گھسیٹتا جاتا تھا رات کو مسودہ صاف کرلیتا تھا، مولانا نے یہ کتاب اس طرح لکھوادی کہ سامنے نہ کوئی نوٹ ہوتا تھا اور نہ کبھی مجھ سے پوچھا کل کیا لکھوایا تھا۔" (صفحہ ۱۹۰)

اس کے بعد لکھتے ہیں:۔

"یہ کتاب خاص اہمیت رکھتی ہے مولانا نے اپنے والد مرحوم کے حالات بھی لکھوا دئے ہیں اور خود اپنے حالات بھی چار سال کی عمر سے۔" (صفحہ ۲۱)

اسی صفحے پر لکھتے ہیں:۔

"اس کتاب کو یہ امتیاز بھی حاصل ہو کہ مولانا کی روزمرہ کی بات چیت قلمبند ہوگئی ہے۔"

ایک جگہ دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

"تو میں نے مولانا کو پھسلانا شروع کیا۔ پھسلانے کا لفظ جان بوجھ کر لکھا ہے ــــ بھلا مولانا کو کون پھسلا سکتا تھا، مگر دل کی محبت کا عالم اور ہی ہوتا ہے، آخر راضی ہوگئے

مولانا آزاد نے (بروایت ملیح آبادی صاحب) اگرچہ شاہ شہیدؒ وغیرہ پر لگائے ہوئے اپنے والد کے بعض الزامات کو خود ہی بہتان تک قرار دیدیا ہے۔ اور اختلاف مسلک میں اپنے والد کی تائید نہیں کی ہو مگر چونکہ نہ الزامات کی کوئی باقاعدہ تردید کی گئی اور نہ اُن کے مسلک کی غلطی کی طرف اشارہ کیا گیا۔ مزید برآں، کتاب کے مطالعہ سے مولانا کے والد اور والد کے نانا دونوں حضرات کی بے پناہ علمیت اور پاکبازی و روشن ضمیری کا سکہ قارئین کے قلوب پر جمنا لازمی ہے، جس کے بعد خاندان ولی اللّٰہی کے مخالف مسلک کو قدرتی طور پہ وہ ذہنی اور روحانی وزن حاصل ہوتا ہے جس سے وہ اب تک محروم رہا ہے۔ اس لئے اس کتاب پر ایک تحقیقی تبصرے کی ضرورت تھی ہمیں خوشی ہو کہ یہ کام مولانا فریدی جیسے اہل کے حصہ میں آیا۔ اور انھوں نے تحقیقی کاوش کا حق ادا کر دیا۔ علاوہ اس خاص پہلو کے خالص علمی و ادبی نقطۂ نظر سے بھی یہ تبصرہ ایک گرانقدر خدمت کی حیثیت رکھتا ہے جس کی داد اہل نظر ہی دے سکتے ہیں اور وہی اسکی ضرورت سمجھ سکتے ہیں۔

تبصرہ اگرچہ بہت طویل ہے، مگر ہمارا خیال ہے کہ اس کو بالاقساط شائع کرنا، اہل ذوق پر بہت شاق ہوگا، خود ہم بھی اس کو ایک ہی دفعہ میں شائع کر دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ اس لئے ایسا ہی کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

مولانا آزاد مرحوم جنھیں دنیا سے رخصت ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے علم و فکر اور فہم و نظر کے اعتبار سے ہندوستان ہی کی نہیں تمام دنیائے اسلام کی ایک قابل فخر شخصیت تھے۔ اُن کا علمی شغف و انہماک اُن کی وسعت نظر، ان کا حافظہ، ان کی تاریخی معلومات، ان کا نہ ختم ہونے والا شوق مطالعہ، اُن کی قوت اخذ و استنباط، اللہ کا ایک ایسا عطیہ تھا جس کا فیضان ان کی تمام تحریروں اور تقریروں میں نمایاں ہے ـــــــــ انھوں نے اپنی خداداد ذہانت و فطانت، ذکاوت و فراست، اور تجربہ و مہارت کی مدد سے سیاسیات ہی میں نہیں، بلکہ تاریخ و ادب کلام و عقائد میں بھی بہترین علمی شاہکار چھوڑے اور اردو زبان کو ایسے علمی و ادبی خزانے سے مالا مال کیا جس سے ہر دور کا مؤرخ و ادیب فیض یاب ہوتا رہے گا۔ انھوں نے ترجمان القرآن لکھ کر، اردو کی پرشکوہ تفسیر اور شاندار ترجمے کے ذریعے قرآن کی شوکت و عظمت کا اور اسکے معانی و بیان کی سربلندی کا بہترین انداز میں اظہار کیا۔ غرضکہ وہ نصف صدی تک علم و ادب، خطابت و بیان، سیاست و فراست

یا واقعات کے ضبطِ سنین میں ایسا تضاد و تناقض ہو کہ جس سے واقعہ کے وقوع ہی کی نفی ہوتی ہو۔ اس کتاب میں جو بہت سی تاریخی غلطیاں ہیں وہ تسامح اور سہو کے ذیل میں نہیں آتیں، اور نہ اسماء رجال، اسماءِ کتب اور اسماءِ آثار کی بعض اغلاط کو کاتب کے سر ڈالا جا سکتا ہے۔ حد یہ ہے کہ مولانا کے ایک استاذ کا نام تک بار بار غلط آتا ہے۔

اس کتاب کو برادرم حکیم سید حسن مثنیٰ صاحب رضوی ندوی مدظلہ نے بھی غور و خوض کے ساتھ ملاحظہ فرمایا۔ جنھیں مولانا سے اجراءِ الہلال کے زمانے ہی سے غیر معمولی عقیدت پیدا ہو گئی تھی اور بعض اہم علمی اور تاریخی موضوعوں پر ان کی مکاتبت بھی رہی اور ملاقاتیں بھی ہوئیں[1]۔ انھوں نے بعدِ مطالعہ اس کتاب کے قابلِ تحقیق اور لائقِ تنقید مقامات کی نشاندہی کی اور اجمالی طور پر کچھ زبانی تبصرہ فرمایا، اسکے بعد میں نے دوبارہ اِن مقامات کو دیکھا، اور متعدد کتابوں اور بعض اہلِ تحقیق اُدباء سے اِن کے بارے میں رجوع کیا میں نے جتنا جتنا اس کتاب کے قابلِ تنقید مقامات پر غور کیا میرے دل نے بے ساختہ یہ کہا، کاش یہ کتاب صرف "کہانی" نہ ہوتی مولانا آزاد کی شان کے مطابق اُن کی زندگی کی آئینہ دار ہوتی، اس میں حقائق ہوتے، صحیح واقعات ہوتے

مجھے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے بڑی دشواری پیش آرہی ہے اِدھر مولانا آزاد کی کہانی اور بقول ملیح آبادی صاحب انھیں کی زبانی میرے سامنے ہے اور دوسری طرف تاریخی حقائق کی روشنی میں بات کچھ کی کچھ ہے۔

مولانا ملیح آبادی پر (جن کی حیثیت محض ناشر و کاتب کی ہے) خیانت و عدمِ دیانت کا الزام بلا دلیل لگایا نہیں جا سکتا۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ میں نے اس میں کسی قسم کا تصرف یا تغیر و تبدل کرنا خلافِ دیانت سمجھا ہے۔ بلکہ ایسا گمان کرنا بھی مشکل ہے۔ اس لئے کہ مولانا ملیح آبادی کا مولانا مرحوم سے جیسا تعلق معلوم ہے وہ اس طرح کی کسی بات کے بالکل منافی ہے۔ دوسری طرف یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ مولانا آزاد ایسی صریح غلطیاں کریں اور ایسی ہوائی باتیں املا کرائیں جیسی اس کتاب میں موجود ہیں کیا اچھا ہوتا اگر مولانا ملیح آبادی جرأت و ہمت سے کام لے کر مولانا کی

[1] حاشیہ اس مضمون کے آخری صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔ "الفرقان"

اور تذکرہ میں جن معاملات کا اجمال ہے ان کی شرح بھی آگئی۔ مگر ہوا کیا دوسرے دن صبح ہی مسودہ لوٹا لیا گیا، فرمایا نظر ثانی کر لوں۔ عرض کیا آپ کی نظر ثانی کا حال معلوم ہے یعنی مسودہ غائب اور ہوا بھی یہی۔" (ص۲۱،۲۳)

ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"اس کتاب میں بعینہ وہی کچھ ہے جو مولانا کی زبان سے نکلا تھا میں نے اس میں کسی قسم کا بھی تصرف یا تغیر و تبدل کرنا خلاف دیانت سمجھا ہے۔ عجائبات روزگار میں سے یہ کتاب بھی اس لحاظ سے ایک عجوبہ ہے کہ مولانا اپنی پوری زندگی میں شاید کوئی چھوٹی سی چھوٹی بات بھی بھولے نہیں۔ مگر لکھا دینے کے بعد اس کتاب کو بالکل ہی بھول گئے ـــــ مجھے حق الیقین ہے کتاب یاد آجاتی تو "نظر ثانی" کے بہانے ضرور چھین لیتے اور کتاب اُن کے بےشمار مسودوں میں ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہر ملاقات پر دل دھڑکتا کہیں کتاب مانگ نہ بیٹھیں خود میں بھی اپنی جگہ بڑا "کائیاں" تھا ـــــ کتاب کا معاملہ اس طرح غائب رکھا جیسے موجود ہی نہیں آپ کو کہیں جگہ حاشیے میں نظر آئے گا "مسودے میں جگہ خالی ہے" اسی لئے کہ مولانا کو یاد ہوا نہیں اور کتاب دنیا سے محروم ہو گئی۔ (ص۲۲)

میں نے اس کتاب کو جو بقول مولانا ملیح آبادی عجائبات روزگار میں سے ایک عجوبہ ہے ـــــ ذوق و شوق کی نظر سے دیکھا۔ کتاب واقعی بڑی دلچسپ ہے، اور ایک تاریخی عظمت رکھنے والے انسان کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے اس میں ایک خاص دلکشی بھی ہے ـــــ لیکن تنقید کی نظر سے دیکھا جائے تو پھر یہ باور کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ مولانا آزاد ہی کی لکھائی ہوئی اور بعینہ انھیں کے الفاظ میں ہے ـــــ یہ صحیح ہے کہ مولانا نے یہ کتاب اس طرح لکھوائی کہ کوئی نوٹ تک اُن کے سامنے نہ ہوتا تھا۔ لیکن مولانا کے خداداد حافظہ کے پیش نظر جس کا مولانا ملیح آبادی نے بھی ذکر کیا ہے اور خود مولانا نے بھی اپنے بعض مضامین و خطوط میں اللہ کے اس انعام کا تذکرہ کیا ہے، یہ بات مستبعد نظر آتی ہے کہ مولانا کو اپنی ذات یا اپنے بزرگوں کے حالات و واقعات لکھواتے وقت ایسا تسامح ہوا ہو جس سے واقعہ کا وقوع ہی تاریخی و تحقیقی حیثیت سے ناممکن ہو جائے۔

مولانا کی مشہور و مسلم قوت حافظہ سے کس قدر بعید معلوم ہوتے ہیں۔

(۱) ص۴۴، ۴۵ پر مولانا منورالدین کے مشاہیر تلامذہ کے نام گناتے ہوئے لکھا ہے:۔

"مولوی محبوب علی جو غدر سے پہلے دہلی کے مشہور عالم تھے۔ مولوی فضل امام جو فضل حق کے والد تھے، مولوی فضل رسول بدایونی اور مولانا محمد علی گوپامئوی صاحب کشاف اصطلاحات الفنون وغیرہ۔"

اس جگہ صرف آخری "شاگرد" کے متعلق عرض کرنا ہے (مولانا منورالدین کے دوسرے "شاگردوں" کی بحث آگے آرہی ہے) صاحب کشاف اصطلاحات الفنون کا اسم گرامی تو قاضی محمد اعلیٰ تھانوی ہے، جو تھانہ بھون ضلع مظفر نگر کے ساکن تھے، مولانا محمد علی گوپامئوی (بشرطیکہ اس نام کے کوئی مشہور عالم گوپامئو میں گذرے بھی ہوں) صاحب "کشاف اصطلاحات الفنون" نہیں ہیں کہانی کے ص۲۶۲ پر ان صاحب کو مولوی علی تھانوی فرمایا ہے "ایک عجیب رسالہ مولوی علی تھانوی صاحب اصطلاحات الفنون کا بھی ملا" (ص۲۶۲) اس جگہ نسبت مکانی صحیح ہے نام پھر غلط ہے۔

(۲) ص۶۷ پر مشہور مناظر و ادیب مولانا رشید الدین دہلویؒ شاگرد شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کو مولانا رشیدالدین معقولی صاحب رشیدیہ لکھا ہے حالانکہ رشیدیہ کے مصنف دوسرے ہی ان کا نام نامی شیخ محمد رشید جونپوریؒ ہے جو گیارہویں صدی ہجری کے مشہور و جلیل القدر عالم اور شیخ طریقت تھے، یعنی شاہ عبدالعزیز صاحب سے بھی متقدم!

(۳) قصبہ نیمی ضلع عظیم آباد (پٹنہ) کے مشہور محدث و ادیب جو خود مولانا آزاد کے اُردو شاعری میں استاد ہیں یعنی ابوالخیر مولانا محمد ظہیر احسن شوق نیموی نقشبندی، مجددیؒ ان کا نام مختلف جگہ مختلف ہے۔

ایک جگہ ہے "مولوی ظہیر الحسن مرحوم جن سے میں نے شاعری میں اصلاح لینی شروع کی تھی۔" ص۲۱۲

دوسری جگہ ہے "اس زمانے ایسا ہوا کہ شاعری کے متعلق کتابوں کی جستجو میں اصلاح اور ازاحۃ الاغلاط لکھنؤ سے منگوایا یہ دونوں رسالے مولوی

زندگی ہی میں اس کہانی کو شائع کر دیتے۔ اب کس سے دریافت کیا جائے کہ حقیقت کیا ہے؟ اور کون جواب دے　　　تسوید و ترتیب کے ۳۰ سال بعد اور مولانا کی وفات کے معاً بعد اس کا منصۂ شہود پر آنا پتہ نہیں کس مصلحت پر مبنی ہے؟ مولانا ملیح آبادی مجھے معاف فرمائیں میں اپنے دل کی بات کہہ رہا ہوں کہ بہتر یہی ہوتا کہ ترجمان القرآن کا مؤلف جلیل، الہلال کا مدیر اعلیٰ اس کہانی کے پورے مسودے کو غائب کر دیتا اور اس "اعجوبۂ روزگار" کے مطالعہ کا موقع کسی کو نہ ملتا۔

بہرحال اب جبکہ یہ کہانی سامنے آچکی ہے، تو یہ فیصلہ تو وہ لوگ کریں جو اس کی اہلیت رکھتے ہیں اور جن کے پاس اس باب میں کچھ معلومات ہوں کہ اس کہانی کی اصلیت کیا ہے۔ میں نے تو محض سامنے آئی ہوئی ایک کتاب پر تنقید کی حیثیت سے اس کے کچھ واقعات اور بیانات کو تاریخی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے پرکھا ہے اور وہی قارئین کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ اس تبصرے سے میری غرض تاریخی حقائق کا اجاگر کرنا ہے اور بس　　　میں مولانا آزاد کی علمی اور ادبی بلندی کا قائل و معترف تھا اور ہوں۔ اُن کی محبت اور ان کی تحریروں سے قلبی تعلق مجھے شروع سے ہے۔

میرا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ میں نے اس تبصرے میں کتاب کے تمام گوشوں کو لے لیا ہے، اور یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ تنقید کرتے وقت خود مجھ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی ــ مگر جہاں تک میری استطاعت کا تعلق ہے میں نے خوب تلاش و جستجو کر کے یہ مختصر تبصرہ لکھا ہے ـــــ میرے اس تبصرے میں خاندان شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے واقعات پر دوسرے واقعات کے مقابلے میں کچھ زیادہ تفصیل ملے گی　　　اور سچ پوچھیے تو اس تبصرے کا خاص محرک بھی یہ جذبہ ہے کہ خاندان ولی اللہی کے صاف و شفاف دامن پر جو غلط دھبے لگائے گئے ہیں وہ صاف ہو جائیں ــ قلتِ فرصت کے باعث اس نقطۂ نظر سے بھی کچھ گوشے تشنۂ تنقید رہ گئے ہوں تو بعید نہیں۔

سب سے پہلے اسماء رجال اور اسماء کتب وغیرہ کو لیجیے ـــــ اور ملاحظہ فرمائیے یہ تسامحات

حالانکہ زمان شاہ تیمور شاہ کا بیٹا اور احمد شاہ ابدالی کا پوتا ہے۔

مولانا آزاد کا خاندانی سلسلہ

شیخ جمال الدین

"میرے خاندانی سلسلے میں سب سے پہلے شیخ جمال الدین معروف ...... بہ بہلول دہلوی کا نام بہت ممتاز نظر آتا ہے ان کا وطن دہلی مرحوم تھا، اور عہد اکبری کے مشاہیر علماء اور اصحاب سلوک وطریقت میں سے تھے الخ" (ص۲۵)

شیخ جمال الدین دہلوی کا ذکر کرتے ہوئے منتخب التواریخ۔ تذکرۃ الواصلین اور اخبار الاخیار کا حوالہ دیا گیا ہے۔ منتخب اور تذکرۃ الواصلین تو اس وقت میرے پاس نہیں ہے البتہ اخبار الاخیار (مولفہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی) کو دیکھا تو عجیب حیرت انگیز انکشاف ہوا وہ یہ کہ شیخ جمال الدین دہلوی کے فضائل کا ذکر کرتے ہوئے کہانی میں شیخ عبد الحق دہلویؒ کی جو جو شہادتیں بحوالہ اخبار الاخیار پیش کی ہیں وہ شیخ جمال الدین کے بارے میں نہیں ہیں دوسرے بزرگوں سے متعلق ہیں۔

اخبار الاخیار میں شاہ قمیصؒ کا تذکرہ ہے اس میں شیخ محدث دہلویؒ ارقام فرماتے ہیں:۔

"وازانجملہ شیخ عبد الرزاق المشہور بشیخ بہلول مرید وخلیفہ اوست جامع است میان علم شریعت وطریقت ازاول فطرت برنشاۃ عبادت وتقویٰ وصلاح برآمدہ ودرعصمت ذاتی نشوونما یافتہ۔ بعد تحصیل علوم دینی بہ تہذیب اخلاق وتبدیل صفات موفق شد، والحق دریں زماں درزمرۂ درویشان سالکان اینچنیں مردم درسلوک ایں طریق ورسوخ قدم واتباع سنت حضرت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نادر وعزیز الوجود اند" (اخبار الاخیار ص۱۹۹ مطبوعہ محمدی دہلی)

کہیں کہیں ایک دو لفظوں کا فرق کر کے بعینہ یہی عبارت آزاد کی کہانی میں شیخ جمال الدین کے بارے میں ملے گی (ص۳۲)

غالباً شیخ جمال الدین کی عرفیت شیخ بہلول دہلوی اسی لئے تجویز کی گئی ہے کہ شیخ عبد الرزاق المشہور بشیخ بہلول کا خلعتِ کمال اُن کے جسم زیبا پر کچھ نہ کچھ درست آجائے۔ مگر اسکا کیا علاج کہ شیخ بہلول کا نام عبد الرزاق ہے اور اتفاق سے سکونت بھی دہلی کی نہیں ہے۔

ظفر احسن شوق نیموی کے تھے" صفحہ ۲۴۱

(۴) عہد بہادر شاہ کے مشہور درباری طبیب حکیم احسن اللہ جو بعض سیاسی خصوصیات کی بنا پر ۱۸۵۷ء کی تاریخی شخصیت ہیں ان کا نام صفحہ ۵ پر دو جگہ احسان اللہ کر دیا گیا ہے۔

(۵) "مولانا اسمٰعیل شہید نے تقویۃ الایمان اور جلاء العینین وغیرہ میں لکھا ہے"

(آزاد کی کہانی صفحہ ۱۶۵)

مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی جلاء العینین ـــ کوئی کتاب نہیں ہے، غالباً یہاں علامہ نعمان آلوسی کی کتاب جلاء العینین فی محاکمۃ الاحمدین کا تشابہ لگ گیا، البتہ مولانا شہیدؒ کی ایک کتاب کا نام تنویر العینین ضرور ہے۔

(۶) "اسی زمانے میں معیار الحق دیکھی اور اس کا جواب ارشاد الحق مولانا ارشاد الحق کا .... اور صاحب ارشاد الحق کا علمی ضعف صاف صاف نظر آگیا"

معیار الحق مولفہ مولانا نذیر حسین مرحوم کے جواب میں ارشاد الحق کوئی کتاب نہیں ہے ـــ انتصار الحق ہے جو مولانا ارشاد الحق رامپوری کی نہیں، مولانا ارشاد حسین مجددی رامپوریؒ کی ہے ـــ تذکرۂ کاملان رام پور میں مولانا ارشاد حسینؒ کی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:-

"تصانیف میں ایک ضخیم کتاب انتصار الحق بزبان اردو بجواب معیار الحق مولانا نذیر حسین محدث دہلوی تصنیف کی ہے اور مطبوعہ ہے یہ کتاب دوبارہ طبع ہو چکی ہے" (تذکرۂ کاملان رام پور صفحہ ۲۳)

(۷) فقہ کی مشہور کتاب الجوہرۃ النیرہ کو صفحہ ۳۵۵ پر جواہر نیرہ لکھا ہے۔

(۸) "چنانچہ بیگم اورنگ کی مسجد میں ایک مدرسہ قائم کیا یہ مسجد چھوٹے پیمانے پر جامع مسجد کے نمونے پر ہے .... شاہ عبدالقادر مترجم قرآن اس کے منتظم تھے" (صفحہ ۴۴)

اوّل تو اس نام کی کوئی مسجد دہلی میں نہیں، دوسرے شاہ عبدالقادرؒ کا قیام جس مسجد میں رہتا تھا وہ اکبر آبادی مسجد تھی جس کو اکبری مسجد بھی کہہ دیتے ہیں۔

(۹) "زمان شاہ بن احمد شاہ" صفحہ ۳

.... غدر سے سات آٹھ سال پہلے جب شاہ محمد اسحٰق و شاہ محمد یعقوب نے ہجرت کی تو یہ بھی اُنکے ساتھ چلے گئے" ص۶۳

شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ میں سے شیخ محمد پیرہ نام کے کوئی بزرگ کسی کتاب میں نظر سے نہیں گذرے۔ تعجب ہے کہ یہ دہلی کے باشندے تھے اور معمولی خاندان کے آدمی بھی نہ تھے پھر ذاتی حیثیت سے بھی اُنکی یہ خصوصیت تھی کہ آفتابِ علم و عمل حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی شاگردی کا فخر حاصل تھا پھر بھی دہلی اور بیرون دہلی کے کسی مُورّخ اور تذکرہ نگار نے ان کا ذکر نہیں کیا۔

علاوہ ازیں شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ اور ان کے برادرِ خُرد شاہ محمد یعقوب محدث دہلوی نے ۱۲۵۸ھ میں ہنگامۂ ۱۸۵۷ء سے تقریباً پندرہ سال پہلے ہجرت کی ہے۔ نہ کہ سات آٹھ سال پہلے ـــ میر ظہور علی صاحب نے اُن کی تاریخ ہجرت یوں لکھی ہے۔[۱]

مولوی اسحٰق صاحب، باکمال　　ترکِ خانہ کرد، سوئے کعبہ رفت
سال تاریخش چنیں گفتہ ظہور　　یک ہزار و دو صد و پنجاہ و ہشت

۱۲۵۸ھ

(احکام العیدین مولفہ نواب قطب الدین دہلویؒ)

اس موقع پر اتنا عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ شیخ محمد اور شیخ محمد احسن کے درمیان جو چھ سات پیڑھیاں ہوں گی انمیں سے کسی کا ذکر نہیں ہے، یہ کیونکر باور کیا جائے کہ مولانا کو اپنے ان درمیانی اجداد کے نام معلوم نہ تھے اور اس وجہ سے یہ سلسلہ غیر متصل رہ گیا۔　　یہ بھی نہیں معلوم ہو سکا کہ شیخ جمال الدین دہلوی کا خاندان دہلی کے کس محلے میں بود و باش رکھتا تھا حتیٰ کہ خود مولانا کے دادا اور والد کے متعلق

---

[۱] مولوی بشیر نے دارالحکومت دہلی میں اور جناب غلام رسول مہر نے جماعت مجاہدین میں شاہ محمد اسحاق محدث کی تاریخ ہجرت ۱۲۵۶ھ (۱۸۴۰ء) لکھی ہے مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی مولف شاندار ماضی نے الفرقان کے شہید نمبر میں ۱۲۶۲ھ میں انکی ہجرت تحریر کی ہے ـــ حیات ولی میں ۱۲۶۲ھ تاریخ وفات بتائی ہے اور تاریخ ہجرت کا ذکر نہیں کیا ـــ نواب قطب الدین دہلویؒ مولف مظاہر حق نے (جو کہ حضرت شاہ محمد اسحاقؒ کے شاگرد تھے) احکام العیدین کے دیباچے میں دو تاریخیں انکی ہجرت کی درج کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انکا صحیح سال ہجرت ۱۲۵۸ھ ہے۔

کہانی کے صلا۳ پر انہی شیخ جمال الدین کے حق میں اخبار الاخیار کی یہ عبارت لکھی بتائی گئی ہو۔

" شیخ قطب عالم می گفت کہ چوں بملازمت او رسیدم بجہت غلبہ وعظ و نصیحت ....

بے سابقہ تقریب سر برآوردہ فرمود، مہدویہ فرقہ ضالہ اند"

حالانکہ یہ عبارت شیخ داؤدؒ مرید وخلیفہ مخدوم شیخ حامد الحسنی الجیلانیؒ کے بارے میں ہے۔ شیخ قطب عالم، شیخ داؤدؒ کے پاس پہونچے تھے نہ کہ شیخ جمال الدین دہلوی کے پاس (دیکھئے اخبار الاخیار صلا۱۹۶)

کہانی میں صاحب تذکرہ کے حوالے سے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا یہ قول بھی شیخ جمال الدین کے بارے میں درج ہے کہ

" و از تصنیفات اوست شرح اصول بزدوی الخ (صلا۳۲)

مگر شیخ محدثؒ نے تو اخبار الاخیار میں شرح بزدوی کو قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی تصنیف بتایا ہے اور دو جگہ اسکا ذکر کیا ہے ایک تو خود قاضی دولت آبادیؒ کے تذکرے میں دوسرے شیخ محمد عیسیٰ جونپوریؒ کے ذکر میں کہ شیخ جونپوری کی خاطر شرح اصول بزدوی قاضی صاحب نے لکھی ہے ۔

(ملاحظہ کیجیے اخبار الاخیار ص ۱۷۲ و ۱۷۳)

شیخ محمد " شیخ جمال الدین کے لڑکے شیخ محمد تھے........ ان پر تصوف وسلوک کا غلبہ تھا اور دلی میں حضرت سید (؟) احمد سرہندی مجدد کے خلیفہ تھے...... مجدد صاحب کے مکتوبات کے تیسرے حصے میں ان کے نام دو خط ہیں ایک فارسی میں دوسرا عربی میں" (صلا۳۳)

زبدۃ المقامات میں مولانا ہاشم کشمیؒ نے حضرت مجدد کے قریب قریب تمام خلفاء کا ذکر کیا ہے احقر کا ایک مقالہ جو تذکرہ خلفاء مجدد الف ثانیؒ کے عنوان سے الفرقان کے مجدد الف ثانیؒ نمبر میں شائع ہوا ہے اسی سے ماخوذ ہے ــــــ اس میں کہیں شیخ محمد دہلوی کا نام حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خلیفہ کی حیثیت سے نہیں اور نہ کسی اور کتاب میں ان کی یہ حیثیت معلوم ہوئی اور نہ مکتوبات کی تیسری جلد (بلکہ ہر جلد) میں ان کے نام کے دو خط ملے جو فارسی و عربی میں ہوں۔

شیخ محمد احسن کے صاحبزادے | " شیخ محمد احسن کے تین لڑکے تھے سب سے بڑے شیخ محمد یوسف تھے جنھوں نے شاہ عبدالعزیز سے علوم کی تکمیل کی تھی

۱۸۰۳ء میں جب مولانا منورالدین نے دہلی آکر پڑھنا شروع کیا ہے مولانا شہیدؒ کی عمر تقریباً ۲۴ سال ہوتی ہے۔ اس وقت آپ کو درس دیتے ہوئے بھی چھ سات سال ہو چکے تھے اور ۱۸۰۹ء میں جب مولانا منورالدین فارغ ہوئے (جیسا کہ کہانی میں مذکور ہے) اس زمانے میں تو شاہ صاحبؒ کا آفتاب علم نصف النہار پر چمک رہا تھا پھر مولانا منورالدین کا شاہ صاحب کا ہمدرس ہونا کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے۔ مولانا رشیدالدین دہلویؒ بھی شاہ صاحب کے قدیم ترین تلامذہ میں سے ہیں اور وہ یقیناً مولانا اسمٰعیل شہیدؒ سے بھی پہلے فارغ ہو چکے تھے۔ اُن کا مولانا منورالدین کا ہمدرس ہونا اور بھی بعید ہے

شاہ[1] احمد سعید دہلوی مہاجرؒ نے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے نہیں بلکہ اُن کے شاگردوں سے پڑھا ہے: وہ کہاں سے ہمدرس ہو سکتے ہیں۔ رہ گئے مولوی برہان الدین اور مولانا محمد وجیہ، ان سے مجھے کوئی واقفیت نہیں اور پتہ نہیں کہ یہ کس کے شاگرد تھے۔

سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ مولانا منورالدین کے تلامذہ کی فہرست میں مولانا محبوب علی مولانا فضل امام، مولوی فضل رسول بدایونی اور صاحب کشاف اصطلاحات الفنون نمایاں طور پر نظر آرہے ہیں ــــ حالانکہ ان میں مولانا محبوب علی تو حضرت شاہ صاحب کے مشہور شاگرد ہیں ــــ رہے مولانا فضل امام وہ ایک علمی خانوادے کے بانی اور حضرت شاہ صاحب کے معاصرین میں سے اور مولانا سید عبدالواجد کرمانی خیرآبادی کے شاگرد رشید ہیں اور مولانا منورالدین کے دہلی آنے سے مدتوں پہلے دہلی کے صدرالصدور تھے ــ مولانا فضل حق مرحوم کا ہی شاگرد مولانا منورالدین ثابت کرنا مشکل ہے چہ جائیکہ اُن کے والد جو مولانا منورالدین کے پیدا ہونے سے بھی پہلے صاحب درس و افادہ اور مشاہیر علماء میں سے تھے۔

مولوی فضل رسول بدایونی کے متعلق سنئیے وہ تحصیل علم کے لئے دہلی ہی نہیں آئے چہ جائیکہ مولانا منورالدین کے آگے زانوئے تلمذ طے کرتے ــــ ان کے استادوں کی فہرست اکمل التواریخ

[1] انوارالعارفین ص ۴۹۹ پر شاہ احمد سعیدؒ کے تذکرے میں ہے، علوم عقلیہ از مولوی فضل امام و مفتی شرف الدین وغیرہما خواندند و حدیث شریف از تلامیذ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ مثل رشیدالدین خاں وغیرہ خواندند۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے انکے آخری دور میں صرف اجازت اسانید علم حدیث حاصل کی ہو تو بعید نہیں جیسا کہ بعض کتب سے ظاہر ہوتا ہے۔

اس کتاب سے یہ نہ معلوم ہوسکا کہ وہ دہلی کے کس محلے میں رہتے تھے۔

شیخ منورالدین اس کتاب میں سب سے زیادہ معرکۃ آلارا شخصیت مولانا منورالدین کی ہے جو مولانا آزاد کے والد (مولانا خیرالدین) کے نانا تھے ان کے متعلق مولانا آزاد کی زبانی تفصیلی حالات درج کیے گیے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ انھوں نے ابتدائی تعلیم علماء لاہور سے حاصل کی اُسکے بعد وہ اپنے والد کی اجازت کے بغیر دہلی آ گئے اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے۔

۱۸۰۳ء کو یہ دہلی پہونچے تھے چھ سال تک تحصیل علم میں مشغول رہے۔ مکان پر کسی کو اپنے دہلی آنے کی اطلاع نہیں دی ـــــ شاہ صاحبؒ کے اولین تلامذہ مولانا رشیدالدینؒ مولوی برہان الدین مولانا اسمٰعیل شہیدؒ، شاہ احمد سعید اور مولانا محمد وجیہہ وغیرہ اُن کے ہمدرس تھے۔ چھ سال کے بعد جب ان کے والد کے شہید ہونے کی خبر آئی تو یہ قصور چلے گئے اور وہاں سے اپنے اعزہ کو لاکر دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی، اپنا ایک مستقل حلقۂ درس قائم کیا۔ بنگال اور دیگر اطراف ہند سے طلبہ جوق در جوق مولانا منورالدین کے پاس آنے لگے۔

مولانا سدیدالدین، مولوی محبوب علی، مولوی فضل امام جو مولانا فضل حق خیرآبادی کے والد تھے مولوی فضل رسول بدایونی اور صاحب کشاف اصطلاحات الفنون مولانا منورالدین کے شاگرد تھے۔

(دیکھئے از ص۴۱ تا ۴۵)

سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ مولانا منورالدین نام کی دہلی میں کوئی ایسی شخصیت ہوئی بھی ہے جس کی یہ امتیازی خصوصیات ہوں ؟ مجھ کو باوجود تلاش بسیار اس نام کا کوئی ایسا شخص نہ ملا جو شاہ صاحب کی شاگردی کا شرف بھی رکھتا ہو اور اطراف ہند سے طلبہ جوق درجوق اس کے حلقۂ درس میں آتے ہوں ـــــ حیات عزیزی، حالات عزیزی تذکرۂ علماء ہند نیز اُس زمانے کے فتاویٰ اور اُن کی مہروں کو دیکھا کہیں اس عظیم الشان شخصیت کا نام ونشان نہ ملا۔

ذرا غور تو فرمائیے ـــــ مولانا منورالدین ۱۸۰۳ء میں دہلی پہونچے ہیں چھ سال (۱۸۰۹ء تک) تعلیم میں مشغول رہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کو فارغ ہوئے کئی سال گذر گئے تھے کیونکہ حضرت شہیدؒ سولہ سال کی عمر میں فارغ ہوئے ہیں۔ ۹ ۲ اپریل ۱۷۷۹ء آپ کا سال پیدائش ہے۔

(۷ رمضان ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۸۰۶ء کو) انکے فارغ ہونے سے تقریباً تین سال پیشتر ہوچکا تھا ——
علاوہ ازیں رکن المدرسین بھی عہد مغلیہ میں کوئی عہدہ تھا؟ جو ایک طرح کی وزارت تعلیم تھی، اس کو علم تاریخ کے ماہرین خصوصاً مغل سلاطین کے انتظام سلطنت اور قوانین مملکت سے واقفیت رکھنے والے ہی اچھی طرح بتا سکتے ہیں۔ کم از کم میری نظر سے تو عہد مغلیہ کے آئین و دستور میں اس نام کا یا ملک العلماء، نقیب الاولیاء اور ملک الاطباء کا کوئی عہدہ نہیں گزرا اور نہ وہ فرائض و اختیارات جو اس کتاب میں بیان کیے گئے ہیں نظر سے گذرے آئین اکبری میں ان چاروں عہدوں میں سے کسی کا وجود نہیں اور اگر اس کے بعد یہ عہدے قائم ہوئے تھے تو جہانگیر سے لے کر اکبر شاہ ثانی تک کی تاریخوں میں ان کا تذکرہ ہوتا۔ ماثر الامراء اور مآثر عالمگیری میں چھوٹے چھوٹے عہدے دار اور امراء تک کا بھی ذکر ہے مگر ان چاروں القاب میں سے کسی ایک لقب کے ساتھ بھی کسی عہدے دار کا ذکر نہیں۔

جامع مسجد دہلی کا مدرسہ نیز دیگر مدارس اور مولانا منور الدین

"جامع مسجد کے مدرسے اور بعض اطراف کے مدرسوں میں تقریباً پانچسو طلباء کی ضروریات کا انتظام ہوتا تھا شاہ صاحبؒ کے انتقال کے بعد انھوں نے (مولانا منور الدین نے) شاہ صاحبؒ کے رنج کے حلقۂ درس کو جو شاہ ولی اللہؒ کے وقت سے چلا آتا تھا ایک باقاعدہ مدرسہ کی صورت میں مدرسہ عزیزیہ کے نام سے بنا دیا۔ ...... مختلف مساجد جو غیر آباد تھیں انھوں نے ان میں مدرسے قائم کیے چنانچہ بیگم اورنگ کی مسجد میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا جو اب حصار کے متصل چھاؤنی میں آگئی ہے۔ یہ مسجد چھوٹے پیمانے پر جامع مسجد کے نمونے پر ہے اس میں دورویہ تقریباً ساٹھ حجرے ہیں اور لکھا ہے کہ ان سب میں طالب علم تھے اور شاہ عبدالقادر مترجم قرآن اس کے منتظم تھے۔ جامع مسجد کے تینوں دروازوں کے بالائی حجروں میں شاہجہاں نے مدرسہ قائم کیا تھا اور اوپر کی گیلری بھی مدرسے کے کام آتی تھی۔ شاہ عبدالرحیم اس مدرسے میں درس دے چکے ہیں لیکن تنزل حکومت کے بعد یہ مدرسہ بالکل بند ہوگیا تھا۔ مگر انھوں نے (مولانا منور الدین نے) اپنے زمانۂ رکن المدرسی میں از سرِنو اسے جاری کیا اور مفتی صدر الدین جو اس وقت نئے نئے فارغ ہوئے تھے اس کے مہتمم و صدر مدرس قرار پائے یہ درس گاہ غدر سے کچھ پہلے تک رہی" الخ (ص ۴۷، ۴۸)

اس بیان کے متعلق حسب ذیل گزارشات ہیں:۔

جلد دوم مولفہ محمد یعقوب بدایونی میں حسب ذیل ہے:۔

(۱) ان کے والد (۲) دادا (۳) مولانا نور الحق فرنگی محلی (۴) حکیم ببر علی موہانی (۵) شیخ محمد عابد مدنی (۶) مولانا عبد اللہ سراج مکی (اکمل التواریخ ص ۱۵ تا ۲۰)

اس فہرست میں مولانا منور الدین کا نام کہیں بھی نہیں۔

اب رہ جاتے ہیں صاحب کشاف اصطلاحات الفنون قاضی محمد اعلیٰ تھانوی رح وہ حضرت شاہ صاحب رح سے بھی عمر میں کہیں بڑے تھے[1] بھلا جو شخص شاہ صاحب سے بھی عمر میں بڑا ہو اور جس نے شاہ صاحب رح کے پیدا ہونے سے بھی ایک سال پیشتر کشاف اصطلاحات الفنون جیسی معرکۃ الآراء کتاب تالیف کی ہو، کوئی تک ہے کہ اس کو مولانا منور الدین صاحب کا شاگرد بتایا جائے۔ الغرض نہ تو مولانا منور الدین شاہ صاحب رح کے اولین یا آخرین تلامذہ میں سے ہیں اور نہ ان کے شاگرد وہ اشخاص ہیں جو فہرست میں دکھائے گئے ہیں۔۔۔ مجھے تو ان بزرگوار کا وجود ہی دہلی کے علماء میں نہیں مل سکا۔۔۔ میں حیران ہوں کہ مولانا منور الدین کو کس کا شاگرد اور کس کا استاد قرار دوں۔

ایک اور تعجب انگیز بات ان بزرگ کے متعلق سنیئے:۔

"بالآخر جب انکی (مولانا منور الدین کی) شہرت بہت ہوئی اور علم کے علاوہ سلوک طریقت میں بھی مشہور ہوئے جس کا سلسلہ انھیں اپنے والد اور شاہ عبد العزیز سے پہونچا تھا تو شاہ عالم ثانی کے عہد آخر میں ان کو مغلیہ سلطنت کا رکن المدرسین بنا دیا گیا۔" ص ۴۵

قطع نظر اس بات کے کہ یہ بزرگ حضرت شاہ صاحب رح سے علم باطن میں منسلک تھے یا نہیں؟ اور ان کے والد کون سے روحانی سلسلے سے تعلق رکھتے تھے؟ غور طلب یہ امر ہے کہ شاہ عالم ثانی کے عہد آخر میں یہ رکن المدرسین کس طرح بنے جب کہ ۱۸۰۹ء میں فارغ ہوئے اور شاہ عالم کا انتقال

---

[1] نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے سلسلۃ العسجد فی مشائخ السند کے آخر میں جو اپنے کتب خانہ خاص کی فہرست دی ہے اس میں کشاف اصطلاحات الفنون کا اندراج بھی ہے۔۔۔ انھوں نے اس کتاب کا سن تالیف ۱۱۵۸ھ لکھا ہے۔ اس لحاظ سے قاضی محمد اعلیٰ تھانوی رح حضرت شاہ عبد العزیز رح کی پیدائش سے بھی پیشتر صاحب تصنیف و تالیف تھے ان کے نام حضرت شاہ عبد العزیز رح کا ایک مکتوب (غیر مطبوعہ) دیکھنے سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب رح نے ان کا زمانہ پایا ہے۔

اس کا موجودہ ایڈورڈ پارک ہے"۔

اس کے آگے لکھا ہے:۔

"جس وقت اس کے (پارک) لئے زمین ہموار کی جانے لگی تو مسجد کا چبوترہ اور بنیادیں جوں کی توں مثل گنج نہاں کے زمین میں مدفون تھیں ویسے ہی ڈھک دی گئی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خانہ خدا اور یہ بے نظیر عمارت نظروں سے پوشیدہ ہوگئی[1]"

(۴) جامع مسجد دہلی کا مدرسہ تینوں دروازوں کے بالائی حجروں میں نہیں تھا۔ بلکہ مدرسہ کی عمارت جامع مسجد کے نیچے تھی اور جامع مسجد دہلی کے ساتھ ہی اسکی تعمیر ہوئی تھی اس مدرسے کا نام دارالبقاء تھا۔

مرقع سلاطین مولفہ منشی محمد عبدالغفور دہلوی میں لکھا ہے:۔

"دارالشفاء، دارالبقاء ـــ یہ دونوں مکان جامع مسجد کے ساتھ تعمیر ہوئے تھے اور بادشاہ کی طرف سے حکیم مقرر تھے بیماروں کو (دارالشفاء میں) دوا ملتی تھی ـــ اور دارالبقاء مدرسہ ہے۔

ابتداء کا نشان بھی باقی نہیں رہا وہاں اب صرف کیکر کے درخت ہیں (مرقع سلاطین صفحہ ۲۲)

اتحاف النبلاء مولفہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم میں بھی تذکرہ مفتی صدرالدین دہلوی کے ضمن میں۔

"مدرسہ دارالبقاء زیر جامع مسجد دہلی" لکھا ہوا ہے ـــ (اتحاف النبلاء، صفحہ ۲۶)

(۴) شاہ عبدالرحیم دہلویؒ نے دارالبقاء میں کبھی درس نہیں دیا۔ انھوں نے تمام عمر میں صرف ایک مرتبہ اپنے ایک ہمدرس مولانا حامدؒ کے اصرار اور والدہ ماجدہ کے حکم سے فتاویٰ عالمگیری کی ترتیب و تصحیح کے زمانے میں عالمگیرؒ کے یہاں ملازمت کر لی تھی لیکن اُن کے پیرو مرشد خلیفہ ابوالقاسمؒ نے اس ملازمت سے منع کیا ـــ اتفاق سے تصحیح فتاویٰ کے سلسلے میں ایک ایسی بات پیش آگئی کہ انھیں یہ ملازمت ترک کر دینی پڑی۔ عالمگیرؒ نے انکو جاگیر دینی چاہی مگر اس سے بھی انکار کر دیا۔ (انفاس العارفین صفحہ ۲)

ـــ غرضکہ شاہ عبدالرحیمؒ کا اس شاہی مدرسہ دارالبقاء سے کوئی تعلق نہ تھا اور نہ وہ حکومت کے کسی شعبے میں سوائے ان چند ایام کے جو تصحیح فتاویٰ میں گزرے ـــ ملازم رہے۔

(۵) مفتی صدرالدینؒ کے بارے میں نواب صدیق حسن خاں مرحوم (جنھیں مفتی صاحبؒ سے تلمذ کا شرف

---

[1] الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر مقالہ مولانا گیلانی بحوالہ دارالحکومت دہلی۔

(۱) شاہ صاحب کے انتقال کے بعد مولانا منور الدین نے شاہ صاحب کے تنج کے حلقۂ درس کو جو شاہ ولی اللہ رح کے وقت سے چلا آتا تھا مدرسہ عزیزیہ بنا دیا ـــــ یہ ایک ایسا نیا انکشاف ہے جو نہ واقعات دار الحکومت کے مؤلف کو معلوم نہ حیات دلی اور حیات عزیزی کے جامع و مرتب کو کاش کہ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی پتہ چلتا کہ مدرسہ رحیمیہ کہاں تھا؟ اور یہ تنج کا حلقۂ درس کس محلے میں تھا؟ پھر مولانا منور الدین نے مدرسۂ عزیزیہ کا سنگ بنیاد کس جگہ نصب کیا ـــــ؟

(۲) جس مسجد میں شاہ عبد القادر رہتے تھے وہ اکبرآبادی مسجد تھی (اورنگ کی مسجد نہ تھی) شاہجہاں کی زوجہ فتحپوری بیگم کی مسجد فتحپوری جس طرح آباد رہی اسکی دوسری بیوی اکبرآبادی بیگم کی مسجد بھی ۱۸۵۷ء تک بڑی شان و شوکت کے ساتھ گلزار بنی رہی ـــــ حضرت شاہ عبد العزیز رح اور حضرت شاہ عبد القادر رح کے دور میں تو وہ مسجد ایک خاص تبلیغی مرکز کی حیثیت رکھتی تھی ۔ مجاہدین کا ملجاو ماویٰ تھی ۔ حضرت سید احمد شہید اور ان کے رفقاء کا مرجع و موقف تھی ۔ ان حضرات کے بعد بھی اس مسجد کی مرکزیت میں کوئی فرق نہیں آیا ـــــ یہ مسجد ۱۸۵۷ء تک کبھی غیر آباد نہیں رہی اس مسجد کی مرکزیت ہی کو پیش نظر رکھ کر انگریزوں نے ۱۸۵۷ء میں اس مسجد کو تباہ و برباد کر دیا ۔

(۳) "جو اب حصار کے متصل چھاؤنی میں آگئی ہے، یہ مسجد چھوٹے پیمانے پر جامع مسجد کے نمونے پر ہے اس میں دو رویہ تقریباً ساٹھ حجرے ہیں" (کہانی)

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسجد منہدم نہیں ہوئی ابھی موجود ہے ۔ چھاؤنی کے اندر آگئی ہو اگر ایسا ہوتا تو اسکا تذکرہ دار الحکومت دہلی یا آثار الصنادید میں ضرور ہوتا[1] لیکن دہلی مرحوم کا ہر تذکرہ اس مسجد کے تذکرہ سے خالی ہے ۔

دار الحکومت دہلی میں لکھا ہے کہ :-

"فیض بازار ہی میں یہ مسجد تھی جو غدر کے بعد ڈھایا ڈھوئی کی نذر ہوئی " محل وقوع

---

[1] الفرقان ـــــ آثار الصنادید (مطبوعہ نولکشور پریس) حصہ سوم ص۲ پر "مسجد پنجابی کٹڑہ" کے نام سے ایک مسجد کا ذکر ہے ۔ اس ذیل میں یہ بھی درج ہے کہ یہ مسجد اورنگ زیب عالمگیر رح کی اہلیہ نواب اورنگ آبادی بیگم نے بنوائی تھی، کہیں اسی مسجد کو تو "کہانی" میں "اورنگ کی مسجد" سے نہیں تعبیر کر دیا گیا ہے مگر شاہ عبد القادر صاحب رح سے اس مسجد کے تعلق کا مسئلہ پھر بھی باقی رہے گا ۔

بام اور عالی مقام ہے۔ وہ مفتی صدرالدینؒ جو درس و تدریس کے علاوہ افتاء، امتحانات مدارس اور صدارت حکومت، دیوانی کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ بادشاہ وقت کو چھوڑ کر تمام روساء اور اکابران کے مکان پر حاضر ہوتے تھے ___ جو اپنے وقت کے صاحب وجاہت عالم تھے ___ اُن کو مولانا منورالدین "رکن المدرسین" کے مقابلے میں نیا نیا فارغ التحصیل بتاکر مولانا منورالدینؒ کا مقرر کردہ مہتمم و صدر مدرس بتایا جارہا ہے! آخر یہ کیونکر سمجھ میں آنے والی بات ہے؟ اور مزید تعجب کی بات یہ ہے کہ مولانا منورالدین نے جو حضرت مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کے سخت مخالف تھے، صدر مدرس اس شخص کو بنایا جو حضرت شہیدؒ کی تعریف میں رطب اللسان رہتا تھا! نواب صدیق حسن خاں مرحوم لکھتے ہیں:۔

"بارہا از زبانش ثنا و صفت مولانا محمد اسمٰعیل شہید و مولوی اسحٰق دہلوی نزیل مکہ مکرمہ شنیدہ شدہ" (اتحاف)

حیرت کی بات ہے کہ مولانا منورالدین جن کے توسط سے دہلی اور اطراف دہلی کے پچاس سے زائد مدارس کو قلعۂ دہلی سے وظیفے ملتے تھے۔ (دیکھئے کمالی صفحہ) اور جنھوں نے "مدرسہ شاہجہانی دارالبقاء کو از سر نو زندہ کیا" انکا کسی تذکرہ نویس نے ذکر نہیں کیا اور مفتی صدرالدینؒ کا اس زمانے کے ہر تذکرہ نویس نے ذکر کیا ہے۔[۵]

حقیقت یہ ہے کہ مدرسہ دارالبقاء کو از سر نو آباد کرنے والے مفتی صاحبؒ ہی تھے۔ وہی اس کے سرپرست اور وہاں کے طلباء کے کفیل تھے۔ سرسید احمد خاں آثار الصنادید میں لکھتے ہیں:۔

"یہ مدرسہ بالکل خراب و برباد ہو گیا تھا اور بالکل ٹوٹ پھوٹ گیا تھا .... جناب ممدوح (جناب مولانا مولوی صدرالدین خاں بہادر صدر الصدور) نے اپنی عالی ہمتی سے اس دارالبقاء کو زر خطیر صرف کر کے از سر نو مرتب کیا ہے، اور شاہجہانی طور پر جو حجرے

---

[۵] آثار الصنادید ہی کو دیکھ لیجئے۔ مفتی صدرالدین صاحبؒ کا جیسا والہانہ ذکر ہے، وہ تو ہے ہی۔ اُن حضرات کا بھی تذکرہ اس میں ملتا ہے جن کو مولانا منورالدین کا شاگرد بتایا گیا ہے۔ مگر نہیں ملتا تو مولانا منورالدین کا تذکرہ۔ آخر ان سب تذکرہ نگاروں کو مولانا موصوف سے ہی ایسی کیا کد ہو گئی تھی؟

حاصل ہے) تحریر فرماتے ہیں۔

"در عصر خود یگانۂ روزگار و نادرۂ عصر بود" اسکے بعد لکھتے ہیں:۔

"ریاست درس و تدریس معقولات بالخصوص و افتائے ممالک محروسہ مغربیہ بلکہ شرقیہ و شمالیہ دہلی و امتحان مدارس و صدارت حکومت دیوانی بوے منتہی شدہ"

اس کے بعد رقمطراز ہیں "صاحب وجاہت بودند و امراء و علماء و حکام و رعایائے شہر" ان کے مکان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔

سوائے بادشاہ وقت کے، اعیان و اکابر دہلی و نواح دہلی میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو اُن کے مکان پر حاضر نہ ہوتا ہو۔ طلباء اخذ علم کے لئے۔ اہل دنیا مشورۂ معاملات کی غرض سے، انشاء نگار اصلاح انشاء کے واسطے اور شعراء برائے مشاعرہ ان کے مکان پر آتے جاتے ہیں"

اُن کے اخلاق و احسان کا تذکرہ کرتے ہوئے اُن کے اس سلوک کا ذکر بھی کیا ہے جو وہ طلباء دارالبقاء کے ساتھ طعام و لباس اور وظائف کی شکل میں کیا کرتے تھے۔

(ماخوذ از اتحاف النبلاء صفحہ ۲۶)

اس سے بھی بڑھ کر سرسید احمد خاں مرحوم سے سنیئے! آثار الصنادید میں اُن کا تذکرہ شروع ہی اس شعر سے کرتے ہیں:۔

ہزار بار بشویم دہن ز مشک و گلاب ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبیست

(باب چہارم صفحہ ۴۲ مطبوعہ نولکشور پریس)

اس کے بعد چار سطر کے القاب لکھ کر نام زبان پر لاتے ہیں اور کہتے ہیں:۔

"قلم کو کیا طاقت کہ انکے اوصاف حمیدہ سے ایک حرف لکھے، اور زبان کو کیا یارا کہ اُن کے محامد پسندیدہ سے ایک لفظ کہے" (صفحہ ۴۳)

پھر قلم بھی اٹھاتے ہیں تو اعتراف کرتے ہیں:۔

مجلس تمام گشت و بپایاں رسید عمر ما ہمچناں در اوّل وصف تو ماندہ ایم

(ایضاً)

آپنے دیکھا کہ مفتی صدر الدین صدر الصدور کی علمی وجاہت اور عظیم شہرت۔۔۔ کسقدر بلند

مولانا منور الدین نے دکھائی، کتابیں لکھیں" ص۵۶

میں پہلے ثابت کر چکا ہوں کہ مولانا منور الدین ہرگز مولانا شہیدؒ کے ہمدرس نہیں تھے اور جلاء العینین نام کی کوئی کتاب مولانا شہیدؒ کی تالیف یا تصنیف نہیں ہے۔ رہی مولانا منور الدین کی مخالفت شہیدؒ میں سرگرمی و سربراہی، اسکے متعلق عرض ہے کہ مولانا منور الدین کا اوّل تو ان امتیازی خصوصیات کیساتھ وجود ہی عنقا ہے، علاوہ ازیں حضرت شہیدؒ کی علمی شخصیت اور خاندانی وجاہت کے آگے بڑے سے بڑے مخالف کی جرأت نہ ہوئی کہ ان کی مخالفت میں سرگرمی دکھائے۔ اگر کسی معاصر نے علمی حیثیت سے تہذیب و متانت کے ساتھ بعض مسائل میں ان سے تحریری مناظرہ کیا ہے تو وہ مولانا فضل حق خیرآبادی تھے۔

تقویۃ الایمان کے متعلق اتنا عرض کر دوں کہ وہ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیزؒ کے زمانۂ حیات ہی میں سید صاحب اور مولانا شہیدؒ کے سفرِ حج سے پہلے تصنیف ہو چکی تھی۔

مولانا منور الدین نے خدا جانے کون کون سی کتابیں لکھیں، کاش ان کتابوں میں سے کسی ایک کتاب کا سراغ مل جاتا جو مولانا منور الدین نے حضرت شہیدؒ کی رد میں لکھی تھیں۔

جامع مسجد دہلی کا مباحثہ

"مولانا منور الدین نے ۱۲۴۰ھ والا مشہور مباحثہ جامع مسجد میں کیا، تمام علماء ہند سے فتویٰ مرتب کرایا پھر حرمین سے فتویٰ منگایا۔ انکی تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ابتداء میں مولانا اسمٰعیل اور اُن کے رفیق اور شاہ صاحب کے داماد مولانا عبدالحیٔ کو بہت کچھ فہمائش کی اور ہر طرح سمجھایا لیکن جب ناکامی ہوئی تو بحث و رد میں سرگرم ہوئے اور جامع مسجد کا شہرۂ آفاق مناظرہ ترتیب دیا جس میں ایک طرف مولانا اسمٰعیل اور مولانا عبدالحیٔ تھے اور دوسری طرف مولانا منور الدین اور تمام علماء دہلی ___ بحث اُن تمام مسائل پر تھی جو تقویۃ الایمان کیوجہ سے چھڑ گئے تھے" ص۵۶

جامع مسجد دہلی کا یقیناً یہ وہی مباحثہ ہے جس کی مفصل روداد مولوی فضل رسول بدایونی نے اپنی کتاب سیف الجبار میں (ص۴۵ سے ص۴۶ تک) درج کی ہے جس سے مندرجہ بالا بیان کے برخلاف امور ذیل ثابت ہوتے ہیں:-

اُس کے ٹوٹ گئے تھے، اُن کو نئے سرے سے بنایا ہے، اور مدرس نوکر ہیں اور طالب علم پڑھتے ہیں، اُن کی خبر گیری نان و پارچہ کی اُن کی سرکار عالی سے ہوتی ہے۔ سبحان اللہ غور کرو کہ یہ کیا چشمۂ فیض ہے جو اُن کی ذات فیض آیات سے جاری ہے۔"

(باب سوم ص۱۲)

ڈولے کی رسم اور مولانا منور الدین

"بہرحال اکبر کے وقت سے یہ رسم جاری تھی اور بڑے بڑے بادشاہ اسی طرح پیدا ہوئے اسی لئے معاملہ بہت نازک ہو گیا تھا۔ کیونکہ اگر اسکے عدم جواز پر زور دیا جاتا تو یہ معنی تھے کہ جہانگیر، شاہجہاں، دارا شکوہ، شجاع اور فرخ سیر تک کی پیدائش معرض بحث میں آجاتی، اسی لئے یہ ایک ایسا موضوع تھا کہ علماء دنیا کبھی اس طرف اشارہ تک نہ کرتے اور اپنے لئے موجب ہلاکت تصور کرتے تھے۔" (کہانی ص۸)

"مولانا منور الدین ڈولے کی رسم کی علانیہ مخالفت کرتے اور اُسے حرام بتاتے تھے۔"

(ص۵ و ۵)

معلوم نہیں کہ دارا شکوہ اور شجاع کو ڈولے کی پیدا وار کیسے قرار دے لیا گیا حالانکہ یہ دونوں شہزادے، اورنگ زیب عالمگیرؒ کے حقیقی بھائی اور ممتاز محل ارجمند بانو بیگم کے بطن سے تھے — جو اعتماد الدولہ آصف خاں کی صاحبزادی نورجہاں بیگم کی بھتیجی اور مرزا غیاث الدین کی پوتی تھیں اور شاہجہاں کی سوائے ان کے کسی دوسری بیگم کے بطن سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ جو اولاد ممتاز محل کے سامنے زندہ رہی وہ حسب ذیل ہے:۔

(۱) دارا شکوہ (۲) شاہ شجاع (۳) مرزا مراد بخش (۴) اورنگ زیب عالمگیر (۵) انجمن آرا (۶) گیتی آرا (۷) جہاں آرا۔ (تحذرات تیموریہ مولفہ سید ظہور الحسن دہلوی ص۳۷)

مولانا اسمٰعیل شہید اور مولانا منور الدین

"مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ مولانا منور الدین کے ہمدرس تھے۔ شاہ عبدالعزیزؒ کے انتقال کے بعد جب انھوں نے تقویۃ الایمان اور جلاء العینین لکھی اور ان کے مسلک کا ملک میں چرچا ہوا تو تمام علماء میں ہلچل پڑ گئی۔ ان کے رد میں سب سے زیادہ سرگرمی و سربراہی

اس پر مولانا محمد قطب الدین دہلویؒ، مولانا محبوب علی، مولانا محمد کریم اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا عبدالخالق، مولانا مخصوص اللہ، مولانا مملوک علی، مولانا حیدر علی، اور مولانا احمد علی کے ساتھ ساتھ نمایاں طور پر مفتی محمد صدرالدین صدر الصدور کے دستخط بھی ثبت ہیں۔ اسی کتاب منحۃ المومنین کے ص۱۱۶ پر مولانا عبدالقیوم صاحب صدیقی ابن مولانا عبدالحئی بڈھانوی مفتی بھوپال کا یہ خط بھی نقل کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مفتی صدرالدین صاحب اس مسئلے میں اپنے استاد کے مسلک پر تھے۔

مکرما! وما اہل بہ لغیر اللہ نزد عاجز واکثر علماء بلاشبہ حرام است ذبیحہ بلا خلاف حرام و اگر کسے را اختلاف است در غیر ذبیحہ است نہ در ذبیحہ چنانچہ در بنا دہ یک رسالہ الموسوم بزبدۃ النصائح از تصنیف مولوی تراب علی صاحب لکھنوی کہ مواہیر علماء دہلی مثل مفتی صدرالدین صاحب ...... وغیرہ مطبوع شدہ ازاں وضاحت مسئلہ مذکور طلبیدہ اند کہ ہمہ اقوال مختلف وغیر مختلف علماء متقدمین و متاخرین دراں مندرج اند و باقی توضیح و تنقیح معنی ایں آیت شریفہ آنچہ در تفسیر عزیزیہ مرقوم است ور دیگر کتب کمیاب ازاں تشفی خاطر خود خواہند ساخت کہ دقیقہ از دقائق دراں فرو گذاشت نکرده و اضح سامی باد۔ والسلام

(۵ رمضان المبارک ۱۲۷۱ھ)

مکرما! جو جانور غیر اللہ کا نامزد ہو کر ذبح کیا جائے وہ میرے اور اکثر و بیشتر علماء کے نزدیک بلا خلاف حرام ہے کیونکہ اگر اختلاف ہے تو غیر ذبیحہ کے بارے میں ہے نہ کہ ذبیحہ کے۔ اس مسئلہ میں ایک رسالہ زبدۃ النصائح نام کا ہے جو مولوی تراب علی لکھنوی کی تصنیف ہے اور جس میں علماء دہلی مثلاً مفتی صدرالدین صاحب وغیرہ کی مہریں ہیں اور جو طبع ہو گیا ہے۔ اس رسالے سے مسئلہ مذکور کی وضاحت معلوم کریں اس میں علماء متقدمین و متاخرین کے تمام مختلف وغیر مختلف اقوال درج ہیں۔ رہی اس آیت شریفہ کی توضیح و تنقیح تو جو کچھ تفسیر عزیزی میں (شاہ عبدالعزیزؒ نے) لکھا ہے وہ دوسری کتابوں میں کمیاب ہے، اس سے اپنی تشفی خاطر کریں اس میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا گیا ہے۔

پھر بھلا وہ کس طرح اپنی تحقیق اپنے مسلک اور اپنے عقیدہ کے خلاف مولوی منورالدین کے رسالہ پر تقریظ لکھ سکتے تھے۔

نواب سکندر بیگم اور مولانا منورالدین بات یہیں ختم نہیں ہوتی کہ مولانا منورالدین شاہ عبدالعزیزؒ

(۱) یہ مجلس مناظرہ سنہ ۱۲۴۰ھ میں منعقد ہوئی — سنہ ۱۲۴۸ھ میں نہیں — بھلا سنہ ۱۲۴۸ھ میں مولنا عبدالحیؒ اور مولانا شہیدؒ کہاں تھے؟ مولانا عبدالحیؒ سنہ ۱۲۴۳ھ میں وفات پا چکے تھے اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ ۱۲۴۶ھ میں جام شہادت پی چکے تھے۔

(۲) مولانا منور الدین نام کے کوئی صاحب اس مجلس مناظرہ میں معروف یا غیر معروف حیثیت سے موجود نہیں تھے — اگر وہ سرگرم مخالف، بانی مناظرہ اور سربراہ ہوتے تو مولوی بدایونی اُن کا ذکر ضرور کرتے خصوصاً جب کہ کہانی کے بیان کے بموجب مولوی فضل رسول مولانا منور الدین کے شاگردوں میں تھے۔

(۳) حرمین سے کوئی فتویٰ مخالفین نے نہیں منگایا تھا۔ دہلی ہی کے کچھ علماء کی مہریں ایک استفتاء پر تھیں۔

(۴) مناظرانہ گفتگو آخر تک حضرت مولانا عبدالحیؒ سے ہوئی تھی۔

رسالہ ما اُہل بہ لغیر اللہ
اور مولانا منور الدین

"(مولانا منور الدین کا) ایک رسالہ ما اُہل بہ لغیر اللہ کے جھگڑے کی نسبت ہے اس میں نہیں بڑی شکل پیش آئی، اس لئے کہ یہ مسئلہ در اصل شاہ عبدالعزیزؒ کی وجہ سے چھڑا۔ انھوں نے تفسیر فتح العزیز میں اسکی تفسیر کرتے ہوئے صاف لکھ دیا کہ اہلال سے مقصود ندا ہے نہ کہ عند الذبح اس کا منسوب کرنا اگرچہ شاہ صاحب ان کے استاد ہیں تاہم اس مسئلے میں بڑی سختی سے ان کا رد کیا ہے اور اپنے نزدیک یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تمام مفسرین سنت کے خلاف انھوں نے تفسیر کی ہے۔ اس کے آخر میں بہت سے علماء کی تقریظیں و تحریریں ہیں جن میں ایک تقریظ مفتی صدرالدین کی بھی ہے" ص ۵۸، ۵۹

اوّل تو اس معرکۃ الآرا رسالے کا وجود ہی مشتبہ ہے۔ اور اگر ہو بھی تو جہاں تک مفتی صدرالدین دہلویؒ کی تائید و تقریظ کا تعلق ہے اس کے متعلق پورے وثوق سے عرض کرتا ہوں کہ یہ ہرگز صحیح نہیں ہے۔

منحۃ المؤمنین من کید الحاسدین (مولفہ قاضی محمد حسین مطبوعہ پونہ) کے ص ۵۵ پر ایک فتویٰ اسی مسئلے سے متعلق حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی تائید میں درج ہے۔

نواب بیگم کی بالکل کایا پلٹ ہوگئی اور ایک بڑی خلقت اُن کے ہاتھ پر تائب ہوکر مرید ہوئی۔

قیام بھوپال کے زمانے میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا نواب جہانگیر خاں، جو نواب سکندر بیگم سے غایت درجہ وابستہ تھا، جب مولانا کے ہاتھ پر (بیگم کے) تائب ہونے کی وجہ سے بیگم کی نظر التفات سے محروم ہوگیا تو اُن سے سخت حسد و رنج پیدا ہوا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نواب جہانگیر خاں نے انھیں زہر دینا چاہا چنانچہ ایک روز جب بیگم کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے اور متعدد امراء اور خود جہانگیر خاں بھی دسترخوان پر تھے اور بیگم خود اپنے سامنے سے کھانے کی قابیں اٹھا اٹھا کر مولانا کے سامنے رکھتی تھی کہ ایک پلیٹ مزعفر کی بیگم نے اُن کے سامنے اٹھا کے رکھی اسی میں درحقیقت زہر تھا۔ مولانا کو کسی طرح یہ بکیدہ معلوم ہوگیا اور انھوں نے وہ قاب اٹھا کر نواب جہانگیر خاں کی طرف یہ کہتے ہوئے بڑھائی نواب صاحب، یہ آپ کے کھانے کی چیز ہے۔ نواب پر اس بات کا ازحد اثر پڑا اس نے اُسے انکی کرامت تصور کیا۔ بے اختیار کانپنے لگا اور اسی وقت قدموں پر گر کر صدق دل سے تمام معاصی وفسوق سے توبہ کی پھر تو اس کی یہ حالت ہوئی کہ ان کی جوتیاں اٹھا کر پالکی کے ساتھ دوڑتا اور اسے اپنے لئے باعث سعادت سمجھتا۔" (کہانی ص ۶۰ تا ۶۲)

اب تاج الاقبال تاریخ بھوپال مولفہ نواب شاہجہاں بیگم سے حسب ضرورت کچھ اقتباس تحریر کرتا ہوں یہ اقتباس بھی ذہن نشین رہے:-

(۱) غرہ رمضان ۱۲۵۳ھ کو نواب صاحب بہادر (جہانگیر محمد خاں) بتجویز صدر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صدر نشین ہوئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ششم جمادی الاولیٰ ۱۲۵۴ھ کو اسلام نگر میں میری ولادت ہوئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۲۵۶ھ میں محلہ جہانگیر آباد آباد کیا ___ اٹھائیسویں ذی قعدہ سنہ ۱۲۶۰ھ کو چھبیس برس کی عمر میں اُنکا (نواب جہانگیر محمد خاں کا) انتقال ہوا۔ نور باغ میں مدفون ہوئے۔

(تاج الاقبال دفتر اول ص ۴۱ و ۴۲)

(۲) (نواب سکندر بیگم) ۱۲۳۳ھ میں پیدا ہوئیں اٹھارویں ذی الحجہ سنہ ۱۲۵۰ھ کو انکا نکاح (نواب جہانگیر محمد خاں سے) ہوا پندرھویں محرم ۱۲۶۳ھ کو مختار ریاست ہوئیں، نویں شوال ۱۲۷۶ھ کو برضامندی میری اور منظوری نواب گورنر جنرل بہادر نائب السلطنت فرمانفرمائے ہند، صدر نشین بھوپال ہوئیں اور رئیس مستقل ٹھہریں۔ سترہویں رجب ۱۲۸۵ھ کو اس دار فانی سے سرائے جاودانی

کے ارشد تلامذہ میں سے تھے یا نہیں ؟ اور وہ رکن المدرسین کے بلند پایہ عہدے پر فائز رہے یا نہیں ؟،
انھوں نے جامع مسجد دہلی میں مخالفینِ شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ کے ہمراہ ہوکر مجلس مناظرہ میں گرمی کے ساتھ
حصہ لیا تھا یا نہیں ؟ اُن کے دیگر کارہائے نمایاں کی طرح اُن کا سفر بھوپال بھی بڑا دلچسپ اور بڑا ہی
حیرت انگیز ہے۔ اور اس سفر کی داستان پڑھ کر ایک مستقل سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان بزرگوار نے سفر
بھوپال کیا بھی ہے یا نہیں ؟ ان کے بھوپال پہونچنے پر نواب سکندر بیگم کا ان کے ہاتھ پر تائب ہونا اپنے
عیش محل کو مسجد بنانا، جہانگیر محمد خاں کا "جو نواب سکندر بیگم سے غایت درجہ وابستہ تھا" (یعنی شوہر
نہیں تھے) بیگم کی نظر التفات سے محروم ہونے کی بنا پر اُن سے حسد کرنا اور رقابت میں زہر دینا خود اُن کا
بھی مولانا منورالدین کے ہاتھ پر تائب ہونا اور انکی جوتیاں اٹھاکر پالکی کے ساتھ دوڑنا اور اسے اپنے
لئے باعث سعادت سمجھنا، یہ سب واقعات صنٹ سے صنٹ تک کہانی کے اندر درج ہیں۔

پہلے اس سلسلے کے کچھ ضروری اقتباسات پیش کردوں پھر اس بارے میں عرض کروں گا۔

"ان کے بعد (مولانا محمد اسحاقؒ کے بعد) مولانا منورالدین بھی ہندوستان سے برداشتہ
خاطر ہوگئے اور ہجرت پر آمادہ ہوئے ان کے مریدین و معتقدین تمام شمالی ہند و پنجاب میں پھیلے ہوئے
تھے انھوں نے یہ سنا تو جوق جوق آنے لگے اور کچھ دنوں کے لئے دہلی کا یہ حال ہوگیا کہ ہزاروں آدمی اس
کی آبادی میں بڑھ گئے اس ہجوم کی وجہ سے وہ اس سال نہ جاسکے اور دوسرے سال روانہ ہوئے
...... چنانچہ بمبئی روانہ ہوئے جب بھوپال پہونچے تو نواب سکندر بیگم کا زمانہ تھا وہ ان کا ذکر خیر
پہلے سے سن چکی تھیں، انھوں نے نہایت اصرار کے ساتھ کہا کہ چند دن بھوپال میں قیام فرمائیں ـــ
نواب سکندر بیگم کے حالات ویسے ہی ناخوش گوار تھے جیسے عموماً اُمراء کے ہوا کرتے تھے ـــ مولانا کو
ان حالات کی اطلاع تھی۔ یہ شہر سے باہر رک گئے اور کہلا بھیجا کہ میں اس شرط سے آسکتا ہوں کہ
بیگم صدق دل سے تائب ہو۔ بیگم خود شہر سے باہر آکر ان کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس درجہ
متاثر ہوئی کہ اُن کے ہاتھ پر تائب ہوگئی اور شہر میں لاکر اسی محل میں ٹھہرایا، جسے پہلے ایک تالاب
کے وسط میں عیش و نشاط کے لئے بنایا تھا اور اب مسجد کردیا تھا۔ چند دن کے بعد مولانا نے آگے بڑھنا
چاہا مگر بیگم مانع ہوئی اور چندے توقف کرنے کی درخواست کی۔ اس پر انھوں نے متعجل رفقاء کو سفر
کی اجازت دیدی اور خود اس سال ٹھہر گئے۔ بھوپال میں ان کی وجہ سے بڑی بڑی تبدیلیاں ہوئیں۔

مولانا منورالدین کے مخالف تھے اور بیگم کی نظرِ التفات سے محروم بھی ہو چکے تھے پھر دعوت میں کس تدبیر سے آئے اور یہ زہر آلود پلیٹ بیگم کے دسترخوان پر کس طرح پہونچی؟ علاوہ ازیں زہر کا علم رئیسہ کو تھا یا نہیں؟ اگر تھا تو خود رئیسہ نے جہانگیر محمد خاں سے مولانا کی مخالفت میں سازش کرلی تھی؟ اگر علم نہ تھا تو پھر رئیسہ نے وہی قاب مولانا کے سامنے کیوں بڑھائی اس میں سے خود کیوں نہیں کھایا — کیا اس میں رئیسہ کی بھی کرامت شامل تھی؟ — اور خود مولانا منورالدین کی مذہبی حمیت نے یہ کیسے گوارا کیا کہ وہ ایک غیر محرم رئیسہ کے ساتھ کھانا تناول فرمائیں؟ اور بعد میں جب نواب جہانگیر محمد خاں نادم و تائب ہوگئے اور مولانا کی جوتیاں اٹھائے اٹھائے پالکی کے ساتھ پھرتے تھے تو ان پر اور ان کے خاندان پر اور ان کے حلقۂ اثر پر مولانا منورالدین کے خیالات و عقائد کا اثر کیوں نہیں پڑا؟۔

حقیقت یہ ہے کہ بھوپال میں کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا اور کیسے پیش آتا جب کہ مولانا مذکور کے بھوپال آنے کے وقت نواب جہانگیر محمد خاں کا دنیا میں وجود ہی نہ تھا۔

تاریخ بھوپال شاہد ہے کہ وہاں کبھی ایسے عالم کو جو قرآن و حدیث پر بطریق صحیح عامل نہ ہو، خاندان ولی اللّٰہی کے مسلک کا سخت مخالف ہو۔ کوئی امتیاز نہیں ملا ہے۔ نواب جہانگیر محمد خاں مرحوم سے لیکر نواب سلطان جہاں بیگم تک سب کے سب بدعات سے نفور اور اہل حق کے معتقد رہے ہیں (اور آج بھی بحمداللّٰہ یہ علاقہ شیوعِ بدعات سے محفوظ ہے) چنانچہ خود نواب جہانگیر محمد خاں کے عہدِ حکومت میں مولانا شریف حسین دہلوی قاضی ریاست تھے۔ نواب سکندر بیگم کے زمانے میں نواب صدیق حسن خاں مرحوم پہلے میر منشی رہے پھر مرحومہ نے اُن کے علم و فضل کو ملاحظہ فرماکر ریاست بھوپال کا مہتمم عملہ تاریخ نگاری مقرر کیا پھر وہ افسر محکمہ مدارس اسلامیہ بھوپال بنائے گئے — منشی جمال الدین مرحوم مدارالمہام بھوپال کو یہ عظیم الشان شرف حاصل ہے کہ انھوں نے شاہ ولی اللّٰہ محدث دہلوی کی حجۃ اللّٰہ البالغہ اور ازالۃ الخفا کو سب سے پہلے ہندوستان میں طبع کرایا۔[1]

---

[1] منشی جمال الدین مرحوم مدارالمہام ریاست بھوپال کے مختصر حالات، مآثرِ صدیقی (مؤلفہ صفی الدولہ حسام الملک نواب سید محمد علی حسن خاں ابن نواب سید صدیق حسن خاں مرحوم) میں اس طور پر درج ہیں:۔

"یہ منشی وحیدالدین مرحوم بن محی الدین بن حسام الدین کے بیٹے تھے، سلسلہ نسب ان کا محمد بن ابی بکرؓ

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کو گئیں۔"　　(تاج الاقبال دفتر دوم ص۶)

اسکے بعد یہ طے کرنا ہے کہ مولانا منورالدین نے یہ سفر کس سن میں کیا ہے؟ — آزاد کی کہانی میں صراحتہ کوئی سن نہیں ملتا　اتنا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد اسحاق کی ہجرت کے بعد" یہ بھی ہندوستان سے بر داشتہ خاطر ہوگئے اور ہجرت پر آمادہ ہوئے"........ مگر جب ذرا غور کیا تو خود اسی کتاب سے ضمناً سفر ہجرت اور سفر بھوپال کا زمانہ نکل آیا — اگرچہ حساب لگانے میں رجعت قہقری کرنا پڑی مگر گتھی سلجھ گئی۔　دیکھئے کہانی کے ص ۶۲ و ۶۳ پر ہے:۔

"ایک سال کے بعد مولانا (منورالدین) بھوپال سے ممبئی عازم ہوئے........ یہاں (ممبئی میں) دو سال قیام رہا تیسرے سال مکہ معظمہ پہونچے اور پانچ سال میں پانچ حج کر کے وہیں انتقال کیا اسی سال ہندوستان میں غدر ہوا۔"

ہندوستان میں "غدر" ۱۲۷۳ھ میں ہوا ہے — اس میں سے پانچ سال قیام مکہ کے کم کیے ۱۲۶۸ھ برآمد ہوئے اس میں سے دو سال قیام ممبئی اور ایک سال قیام بھوپال کے کم کئے احتیاطاً ایک سال سفر حج کا بھی کم کیا تو تقریباً ۱۲۶۴ھ برآمد ہوئے۔ یہ زمانہ اُن کے بھوپال آنے کا ہے........ اور اس وقت نواب جہانگیر محمد خاں کا انتقال ہوئے کم از کم چار سال گذر چکے تھے　— خود کہانی کے اندر بھی موجود ہے کہ "جب بھوپال پہونچے تو نواب سکندر بیگم کا زمانہ تھا"— نواب سکندر بیگم ۱۵ محرم ۱۲۶۳ھ کو مختار ریاست ہوئی ہیں، اس سے پہلے اپنے شوہر نواب جہانگیر محمد خاں کے زمانۂ حیات میں وہ مختار ریاست نہیں تھیں خود اُن کے شوہر والی ریاست تھے۔ جیسا کہ تاج الاقبال تاریخ بھوپال کے حوالے سے لکھا جا چکا ہے — اس حقیقت کے بعد کیا اصل رہ جاتی ہے نواب جہانگیر محمد خاں کے مولانا منورالدین سے حسد و رنج کرنے، زہر کھلانے کی کوشش فرمانے اور پھر ان کے ہاتھ پر توبہ کی اور انکی پالکی کے ساتھ ان کی جوتیاں اٹھا کر دوڑنے کی؟ علاوہ ازیں نواب جہانگیر محمد خاں مرحوم تو نواب سکندر بیگم کے شوہر اور بھوپال کے فرماں روا تھے — "وابستگی" کے کیا معنیٰ اور لطف التفات سے محروم ہونے کا کیا مطلب؟

ظفر کی قاب میں زہر بھر دینے کا قصہ اگرچہ بیّن طور پر ختم ہوگیا لیکن قطع نظر تاریخی حقائق کے خود اس واقعے کے اجزا اس کے عدم وقوع پر دلالت کر رہے ہیں۔

غور تو کیجئے — بیگم جب مولانا منورالدین کے ہاتھ پر تائب ہو چکی تھیں تو نواب جہانگیر محمد خاں جو

نواب سکندر بیگم کی صاحبزادی نواب شاہجہاں بیگم جو پابندی احکام دین، عقل و فہم، عدل و انصاف اور انتظام سلطنت میں بے نظیر امتیاز رکھتی تھیں انھوں نے اپنا نکاح ثانی نواب صدیق حسن خاں مرحوم سے کیا — ایک فرماں روا رئیسہ کا زمانے اور ماحول کے رسم و رواج کے خلاف نکاح ثانی کر لینا ایک زبردست اصلاحی انقلاب تھا جس کو شاہ ولی اللہؒ کے وصیت نامے اور حضرت سید احمد اور حضرت شہیدؒ کی جد و جہد کا زریں نتیجہ کہنا چاہیئے۔

سلطان جہاں بیگم کی دینداری اور خوش عقیدگی بھی مسلم الثبوت ہے وہ قطب الوقت، عالم ربانی حضرت مولانا رشید احمد محدث گنگوہیؒ سے بوکالت وسفارت مولانا قاضی محی الدین مراد آبادیؒ ربیع الثانی ۱۳۲۳ھ میں (حضرت گنگوہیؒ کی وفات سے تقریباً دو ماہ قبل) بیعت ہوئی تھیں۔[1]

آخر میں اتنا اور عرض کر دوں کہ بھوپال کے تالاب میں کسی ایسی عمارت، کا جو پہلے نواب سکندر بیگم کا "نشاط محل" ہو اور پھر مسجد میں تبدیل کر دی گئی ہو کوئی نشان نہیں نہ بھوپال کی تاریخ میں اس کا تذکرہ ہے۔

نہر زبیدہ اور مولانا خیر الدین | "ان کے (مولانا خیر الدین کے) زمانۂ قیام حجاز کا ایک یادگار اور تاریخی واقعہ نہر زبیدہ کی مرمت بھی ہے........ اسی زمانے میں ایک سال کے حج میں پانی بالکل بند ہو گیا اور ہزاروں آدمی پیاس سے مر گئے، والد مرحوم نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور منیٰ ہی میں ارادہ کر لیا تھا کہ دوسرے حج کے آنے سے پہلے ہی وہ اس کار خیر کو کر کے چھوڑیں گے........ اس زمانے میں اُن کے مریدین میں حاجی عبدالواحد جو کلکتے اور بمبئی میں حاجی واحد نا کے نام سے مشہور ہیں اور ان کے شریک کار حاجی زکریا تھے.......... اور یہ دونوں اس سال کے حج میں موجود تھے اور والد مرحوم کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے — جب قسطنطنیہ کی طرف سے ناامیدی ہو گئی تو والد نے سب سے پہلے حاجی عبدالواحد اور حاجی زکریا سے تحریک کی اور انھوں نے دو لاکھ کی پہلی رقم پیش کر دی........ اسکے بعد والد نے سات آدمیوں کی ایک مجلس بنائی اور یہ فنڈ اس کے انتظام میں

---

[1] تذکرۃ الرشید جلد دوم ص۱۰۲

نواب سکندر بیگم ایک عفت مآب، عصمت شعار، پابند صوم وصلوٰۃ اور خوش عقیدہ رئیسہ تھیں۔ انھوں نے ۱۲۸۰ھ میں اس زمانے میں حج کیا جب ہندوستان کے نوابوں[51] میں حج کا رواج نہیں تھا۔ حجاز میں انھوں نے ہزارہا روپیہ خیرات کیا[52]، قیام حجاج کے لئے رباط بھوپال کو بنایا اور اس کے تمام مصارف ریاست سے ادا کرتی تھیں۔ جب حج کو گئیں تو مولانا عبدالحیٔ بڈھانویؒ رفیق حضرت سید احمد شہیدؒ کے اکلوتے صاحبزادے مولانا عبدالقیوم[53] محدثؒ کو بھوپال تشریف لانے کی دعوت دی چنانچہ مولانا عبدالقیوم انھیں کی درخواست پر بھوپال آئے اور یہاں بیٹھ کر تشنگان علم حدیث و قرآن کو مدتوں سیراب کیا۔

(بقیہ حاشیہ صـ۱۴) پر منتہی ہوتا ہو قدیم وطن اکابر بریہ سہارنپور تھا ...... منشی جمال الدین خاں مرحوم ۱۲۱۶ھ میں پیدا ہوئے۔ جب سن تمیز کو پہونچے تو تحصیل علم کی غرض سے دارالسلطنت دلی میں آئے ...... مولوی مملوک علی صاحب مدرس مدرسہ انگریزی کے حلقۂ درس میں داخل ہوگئے اور مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے مجالس وعظ میں شریک ہونا انھوں نے اپنے اوپر لازم کر لیا ـــــ اس کے بعد لکھا ہو کہ کچھ حالات ایسے پیش آئے کہ تحصیل علم کا سلسلہ منقطع سا ہو گیا۔ اور پھر ایک خاص واقعہ درج کرکے لکھا ہو کہ ـــــ "تحصیل علم کا سلسلہ از سر نو شروع کیا مولانا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دہلویؒ کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے اور مولوی محمد اسحاق صاحبؒ اور محمد یعقوب صاحبؒ مہاجر مکہ معظمہ سے تعلیم کی تکمیل کی"

اس کے بعد نواب سکندر بیگم صاحبہ کے عہد میں بھوپال پہنچنے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہو:-

"پہلے وہ محض ایک معمولی خدمت پر مامور ہوئے۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد ...... ۱۲۶۳ھ میں نائب ولی (مدارالمہام) کے منصب جلیلہ پر فائز ہوگئے .... مدارالمہام صاحب اعتقاداً و عملاً موحد متبع سنت مدبر، بیدار مغز اور بڑے راسخ الاعتقاد تھے ...... حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے خاندان سے اُن کو خاص ارادت تھی ...... شاہ صاحب کی بہترین تصنیف حجۃ اللہ البالغہ...... انھیں کی وسعت فیاضی اور علم پروری سے پہلے پہل ۱۲۸۶ھ میں چھپ کر شائع ہوئی۔

۲۷ محرم ۱۲۹۹ھ / ۱۸۸۱ء کو مدارالمہام محمد جمال الدین خاں بہادر مرحوم نے شب کے گیارہ بجے رحلت کی"

(مآثر صدیقی حصہ دوم صـ۴۴ تا صـ۵۶)

واضح رہے کہ مآثر صدیقی کے مؤلف، مدارالمہام مرحوم کے حقیقی نواسے تھے۔

[51] تاج الاقبال دفتر دوم [52] تاج الاقبال دفتر دوم [53] جماعت مجاہدین صـ۲۹۴

بیان یہ تھا کہ جب شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنی تمام جائداد اپنے عزیزوں میں تقسیم کردی باقی کے لیے بھی وصیت نامہ لکھدیا اور مولوی اسمٰعیل کے لیے کچھ بھی نہ رہا تو اب دنیا کی طلب دل میں سمائی اور یہ ڈھنگ نکالا کہ پیری مریدی کا ایک نیا کارخانہ جمایا جائے سید احمد بریلوی فوج میں ایک اَن پڑھ سپاہی تھے ان سے سازش کرکے انھیں پیر بنایا۔ مولوی عبدالحی شاہ صاحب کے داماد، کہ وہ بھی بیٹی کے محروم رہ جانے سے برداشتہ خاطر تھے وہ شریک سازش ہوگیے اور صورت یہ قرار دی کہ خدا کی دین میں کسی کا کیا لینا دینا ہے ہم نواسے (؟) اور داماد تھے مگر محروم رہ گئے، اور شاہ صاحب کا تمام باطنی فیض ٹونک کے اس سپاہی کو مل گیا آدمی (مولانا اسمٰعیل شہیدؒ) ذہین اور لسّان تھا بہت جلد لوگوں میں ایک غلغلہ مچا دیا، لوگوں نے جب دیکھا کہ ایک معمولی اَن پڑھ آدمی کو شاہ صاحب کے نواسے (؟) نے پیر مان لیا ہے اس کی پالکی کے آگے جوتی بغل میں دابکے دوڑتا ہے اور علانیہ اپنی محرومی اور انکی فیض یابی کا اقرار کرتا ہے تو اس سے لوگوں میں بڑا ہی رنگ جما اور ہر طرف سے چاندی سونے کی بارش ہونے لگی" الخ (ص۳۶۴)

اس میں شک نہیں کہ مولانا آزاد اپنے والد کے اس قسم کے بیانات سے متفق نہیں تھے اور وہ حضرت سید صاحبؒ اور ان کے رفقاء کے مداحوں میں سے تھے۔ اُن کے والد کے اس قسم کے غالیانہ اور انتہاپسندانہ خیالات وعقائد نے ہی درحقیقت بطور ردّعمل مولانا کو وادیٔ تشکک میں لاکر کھڑا کردیا تھا۔ مولانا آزاد نے اس طرح کے بیانات پر بعض جگہ ریمارک بھی کئے ہیں اور بعض جگہ انھوں نے اپنے والد کی اس قسم کی باتوں کو فتنے سے تعبیر کیا ہے اس مقام پر بھی خیریت سے بہتان عظیم کا عنوان موجود رہی، لیکن بہت سی خلاف تحقیق اور سراسر لغو باتوں پر تنقید نہیں کی گئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مولانا کے والد کی علمیت اُن کے اخلاق عالیہ ان کے تزکیہ نفس اور روحانی کمالات کے اس قدر واقعات کہانی میں بیان کئے گئے ہیں جن کو سامنے رکھ کر بہت سے ناواقفوں کو شبہ ہی نہیں یقین ہوسکتا ہے کہ مولانا خیرالدین جیسا صاحب باطن اور "صاحب بصیرت" شخص جو کچھ بھی مولانا اسمٰعیل شہیدؒ اور رفقاء سید احمد شہیدؒ کے بارے میں کہہ رہا ہے وہ صحیح ہوگا حالانکہ خاندان شاہ ولی اللہؒ اور رفقاء سید احمد شہیدؒ کے بارے میں جو کچھ بھی انھوں نے "گوہر افشانی" کی ہے وہ سراسر بہتان ہی بہتان ہے ــــــ یہ ملحوظ رہے کہ ان بہتانوں کا سرچشمہ اور منبع، مولوی فضل رسول بدایونی کی

دے دیا .... لیکن افسوس ہے روپیہ کی کمی کی وجہ سے یہ کام پورا نہ ہوسکا البتہ نہر کی اس درجے درستگی ہوگئی کہ تیس برس تک پھر کسی طرح کی خرابی واقع نہ ہوئی"

(آزاد کی کہانی ص۹۴ تا ۹۹)

حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں نہر زبیدہ کی مرمت کا ہونا مولانا[۱] رحمت اللہ صاحب کرانوی مہاجر مکہ صاحب اظہار الحق و بانی مدرسہ صولتیہ کا کارنامہ ہے، جن کا علاوہ ہندوستان کے حجاز و ٹرکی میں کافی اثر ورسوخ تھا، مولانا رحمت اللہ کرانویؒ کی سوانح عمری میں لکھا ہے:-

"نہر زبیدہ امتداد زمانہ سے بہت زیادہ قابل مرمت و اصلاح تھی اور پانی کے لیے ساکنان حرم کو کافی دقت و زحمت پیش آتی تھی۔ اسی زمانہ میں سیٹھ عبدالواحد عرف "واحدنا سیٹھ" مکہ معظمہ آئے اور اس سلسلے میں ایک شورتی اجتماع مدرسہ صولتیہ میں منعقد ہوا سیٹھ عبدالواحد صاحب باتوفیق صاحب ہمت دولت مند تھے۔ حضرت مولانا مرحوم (مولانا رحمت اللہؒ) نے نہر زبیدہ کی از سر نو اصلاح و مرمت کا بیڑا اٹھایا اور اس کے لئے حکومت کی اجازت وحالات کے لحاظ سے ایک مستقل مجلس قائم کی گئی جس میں مہاجرین مکہ معظمہ کے ہر طبقے میں سے ہر قوم کے ممتاز افراد مجلس میں ممبر بنائے گئے اس مجلس کی صدارت کے لیے حضرت مولانا مرحوم کو منتخب کیا گیا مگر آپ نے اپنے شاگرد رشید تفضیلت مآب مولانا شیخ عبدالرحمن سراج صاحب مرحوم مفتی احناف و شیخ العلماء مکہ معظمہ کو اس کے لیے موزوں سمجھا اور خود نائب صدر کی حیثیت سے اس عظیم الشان کام کی ذمہ داری اٹھائی۔ سیٹھ عبدالواحد صاحب نہر زبیدہ کے خزانچی اور تحویلدار مقرر ہوئے خدا کا شکر و احسان ہے کہ یہ صدقہ جاریہ ان بزرگوں کی ہمت سے دوبارہ زندہ ہوا۔" (ایک مجاہد معمار ص۵۳)

مولانا خیرالدینؒ کا حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء پر بہتان عظیم

کہانی میں ہے:- "اس بارے میں انکا (مولانا خیرالدین کا)

---

[۱] انکا تعلق اس جماعت اہل حق سے ہو کہ جس کے مولانا خیرالدین سخت مخالف تھے چنانچہ کہانی کے ص۵۲ پر لکھا ہو ـــ "نتیجہ یہ نکلا کہ چند دنوں کے بعد اچانک اس جماعت کے اکثر آدمی گرفتار کر لئے گئے جن میں مولانا رحمت اللہ صاحب اظہار الحق بھی تھے"

کہانی میں اسماعیلیہ اور اسحاقیہ کے عنوان سے ص۱۶۵ پر مولانا خیرالدین کی بے نظیر تحقیق پیش کی گئی ہے وہ بھی سیف الجبار ہی کے ص۵ و۱۵ سے ناتمام طریقے پر ماخوذ ہے۔

اب میں بہتان عظیم کا مختصر جواب دینے سے پہلے میاں سید احمد علی بجنوری (شاگرد حضرت شاہ عبدالعزیزؒ) کے خط کا اقتباس پیش کرتا ہوں جس میں شاہ صاحبؒ کی بیماری اور وفات کے چشم دید حالات بیان کئے گئے ہیں۔ اس خط کا ترجمہ مولانا ذوالفقار احمد بھوپالیؒ نے اپنی کتاب الروض الممطور فی علماء شرح الصدور میں درج کر دیا ہے ۔۔۔ اس خط کا فقط وہ حصّہ جس سے مولانا خیرالدین کے "بہتان عظیم" کی جڑ کٹ جاتی ہے یہاں پر نقل کیا جا رہا ہے۔

"(حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے) روز شنبہ کہ دن درس کا تھا بکمال بے طاقتی منبر پر آرام کر کے تفسیر آیہ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۔۔۔ فرما کر بس کیا۔ پھر دن باقی رہے، فقیر کو طلب فرما کے کاغذ وصیت نامہ مشتمل بر ہبہ فرش و کتب خاص ذات خود بمولوی محمد اسحاق دام ظلہم و دیگر امورات کا لکھوا کر مہر فقیر کی اس پر ثبت کرائی من بعد مولوی رشید الدین خاں صاحب وغیرہ کو طلب کر کے ان کی مہریں ثبت کرائیں اس دن حال بہت متغیر تھا.....

جمعہ کے دن چاہا کہ موافق معمول کے مدرسہ میں آئیں نہ آسکے ۔۔۔ درس موقوف ہوا مگر زیارت سب کو میسر ہوئی۔ وقت شام کے تفسیر مدارک و تفسیر رحمانی سنی بعدہ جو کچھ نقدی تھی اس کو برادرزادوں اور ذوی الارحام حاضر و غائب کو تقسیم فرمایا...... (اس کے دو دن بعد) بعد نماز فجر ساتویں ماہ شوال روز یکشنبہ ۱۲۳۹ھ ۔ داعی اجل کو لبیک اجابت فرمائی اور اس دار فانی سے عالم جاودانی کی طرف انتقال فرمایا۔

إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ"۔ (الروض الممطور ص۲۰۱)

دیکھئے معتبر ترین شاہد کا بیان ہے کہ شاہ صاحبؒ نے حاضر و غائب برادرزادوں و ذوی الارحام کو ۔۔۔ جو کچھ نقدی ان کے پاس تھی تقسیم کر دی تھی ۔ حضرت شاہ محمد اسمٰعیلؒ جو شاہ صاحبؒ کے برادر زادے تھے وفات شاہ صاحب کے وقت دہلی میں موجود نہ تھے۔ مگر حصہ ان کو بھی دیا گیا ایسا نہیں ہوا کہ اُن کو محروم کر دیا گیا ہو ۔ البتہ مولانا محمد اسحٰقؒ صاحب اپنے نواسے کو بحیثیت اپنے جانشین اپنی کتابیں اور فرش فروش ضرور ہبہ کئے ۔۔۔ اس میں مولانا اسمٰعیل شہید کی تخصیص نہیں۔ مولوی محمد موسیٰ، مولوی مخصوص اللہ

کتاب سیف الجبار رہے۔ یہ وہی مولوی فضل رسول ہیں جن سے مولانا خیرالدین کو بڑی مناسبت تھی چنانچہ مولانا آزاد فرماتے ہیں:۔

"ہندوستان کے گذشتہ علماء میں صرف مولوی فضل رسول بدایونی جنھوں نے تقویۃ الایمان کے رد میں ...... لکھی ہے ٹھیک اسی رنگ پر تھے جو اس بارے میں والد مرحوم کا تھا"

(کہانی ص۱۶۴)

حتیٰ کہ مولوی احمد رضا خاں بریلوی جن سے مولانا خیرالدین کے اچھے تعلقات تھے اور جن کو صحیح الاعتقاد فرمایا کرتے تھے جب وہ کلکتہ میں اُن سے ملے اور ایک مسئلے میں اختلاف ہوا تو

"ان کے جانے کے بعد ہم سے کہا کہ اس شخص کے عقیدے میں بھی فتور ہے" [۱] (کہانی ص۱۶۶)

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مولانا خیرالدین کو مولوی فضل رسول بدایونی کی بات پوری طرح یاد نہیں رہی تھی وہ تو یوں "گل افشانی" فرما رہے ہیں:۔

(۱) "شاہ عبدالعزیز صاحب نے بہتر عمر میں اپنا تمام مملوکہ منقولہ کہ ہر جنس کثرت سے تھی حرم اور نواسوں وغیرہ کو ہبہ کر کے خالص کرا دیا مگر مولوی اسمٰعیل کو کچھ نہ دیا"

(سیف الجبار ص۱۷ و ۱۸)

(۲) "جب شاہ صاحب نے اپنی ساری مملوکات اوروں کو ہبہ کردی مولوی اسمٰعیل گھبرائے اور مولوی عبدالحئی شاہ صاحب کے داماد ...... موقوف ہو کر دہلی میں آئے دونوں نے مل کر سید احمد نام ...... شاہ صاحب کے مرید کو پیر بنایا اور ساتھ لے کر شہروں میں پھیری شروع کی۔ اور دربدر گھر گھر قرآن و حدیث کے درس کو وسیلہ ٹھہرایا" (ص۳۴)

---

[۱] جس مسئلہ میں اختلاف ہوا تھا ضمناً اس کی بھی سنئے! ___ لکھا ہے اختلاف مولوی احمد رضا خاں صاحب کے ایک رسالہ پر پیدا ہوا "جس میں انھوں نے عدم ایمان اَبَوَینِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ایمان ابوطالب پر زور دیا تھا" حالانکہ مولوی احمد رضا خاں صاحب کا مسلک اس کے بالکل عکس ہے وہ ایمانِ ابوینِ اور عدم ایمانِ ابوطالب کے قائل ہیں۔ اُن کی تصانیف و ملفوظات میں جابجا اس بارہ میں تصریحات ہیں۔

کے ہاتھ کیسے لگ گئی۔ اس موقع پر بھی اگر مولانا خیرالدین کو مولوی فضل رسول بدایونی کی پوری بات یاد رہتی تو وہ وہی کہتے جو انھوں نے سیف الجبار میں لکھی ہے دیکھئے مولوی بدایونی کتنا عجیب انکشاف فرماتے ہیں ــــــ وہ حضرت شہیدؒ اور رفقاء سید احمد شہیدؒ پر الزامات بیجا لگاتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:-

"ان ہی سامانوں سے سیر و سیاحت کرتے پھرتے تھے کہ تیسرا فاد ظاہر ہوا یعنی کتاب التوحید نجدیہ کی مراد آباد میں کہ وہاں پہلے سے کسی قدر اس مذہب کی گفتگو تھی ـــ ہاتھ لگی ـــ اس مذہب کو پسند کیا اور تقویۃ الایمان تصنیف کی گویا اسی کتاب التوحید کی شرح ہے"۔

(سیف الجبار ص۴۳)

ایک غلط بات کتنے تک سے کہی گئی تھی کہ کتاب التوحید مراد آباد سے مل گئی تھی۔ مولانا خیرالدین نے اسکو تاریخی اعتبار سے خواہ مخواہ پیچیدہ اور دور از کار بنا دیا کہ شاہ ولی اللہ صاحب حرمین سے کتاب التوحید لائے اور شاہ اسمٰعیل صاحب کو اپنے دادا کے کتب خانہ سے وہ کتاب ہاتھ لگ گئی۔ معاندین شاہ اسمٰعیل تقویۃ الایمان کے بارے میں طرح طرح کی باتیں بناتے رہے ہیں، کوئی کہتا ہے کہ سید صاحب اپنے رفقاء کے ساتھ حج کو گئے تو وہابیوں سے متاثر ہوئے اور وہاں کتاب التوحید مل گئی اور تقویت الایمان لکھی۔ کوئی کہتا ہے مراد آباد سے کتاب التوحید مل گئی تھی ان کا دوسرا ایڈیشن تقویۃ الایمان ہو گیا، کوئی کہتا ہے دادا کے کتب خانہ سے کتاب التوحید برآمد کر لی تھی اور اس کا چربہ تقویت الایمان ہے ـــ ٹھکانہ ہے ان محققین کی ژولیدہ بیانی اور اختلاف رائے کا ـــ؟

حضرت شاہ عبد العزیز کی سجادہ نشینی

اب اس سے بھی بڑا بہتان جس کو سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور سن لیجئے۔ ـــ "والد مرحوم (مولانا خیرالدین) کہتے تھے کہ جب انکے (حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے) انتقال کے بعد حضرت شاہ عبد العزیزؒ کی سجادہ نشینی کی مجلس ہوئی اور شاہ فخرالدین مرحوم نے ان کے سر پر پگڑی رکھی تو کان میں کہا تھا۔ تمھارے خاندان کی چادر پر ایک دھبہ لگ چکا ہے اپنی سعی وہمت سے اُسے دھو ڈالنا ـــ یہ شاہ ولی اللہؒ کی طرف اشارہ تھا اور مشہور تھا کہ اُن کو اپنے ذوق تفنن میں اعتزال کی طرف میلان رہا ہے" (ص۲۶۷)

مولانا منورالدین نے تو حضرت مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ اور حضرت مولانا عبد الحئیؒ کے عقائد پر مصنوعی فضا

وغیرہما برادرزادگان کو بھی کچھ نہیں ہبہ کیا گیا ـــــ علاوہ ازیں شاہ عبدالعزیزؒ کے پاس جو ایک درویش صفت متوکلانہ زندگی بسر کرنے والے محدث تھے، کونسے ایسے خزانے اور کونسا ایسا مال کثیر رکھا ہوا تھا جس کا یہ پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے اور اسکی بنیاد پر حضرت سید احمد شہیدؒ کی اصلاحی تحریک کو بدنام کرنے کی کوشش فرمائی جارہی ہو ـــ حضرت شاہ صاحب کو کفن تک گاڑھے کا دیا گیا تھا، اور وہ خود وصیت فرما گیے تھے کہ میرا کفن اس کپڑے کا ہو جو میں پہنتا ہوں۔

"کرتا آپ کا دھوترکا اور گاڑھے کا پاجامہ ہوتا تھا" (الروض الممطور و کمالات عزیزی)

اور یہ تو سب جانتے ہیں کہ مولانا اسمٰعیل شہید حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے بھتیجے تھے مگر مولانا خیرالدین کے اس بہتان عظیم کو بیان کرتے ہوئے دو جگہ شاہ شہیدؒ کو نواسہ لکھا گیا ہے ـــ علاوہ ازیں مولانا عبدالحئیؒ کی اس زوجہ سے جو شاہ عبدالعزیزؒ کی صاحبزادی تھیں کوئی اولاد نہیں ہوئی اور ان صاحبزادی کا انتقال شاہ صاحب کے سامنے ہی ہو گیا تھا ـــ پھر داماد کو شاہ صاحب کے مال میں آرزو کرنے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔؟

حضرت شاہ ولی اللہ اور کتاب التوحید

کہانی میں بیان کیا گیا ہے:۔

"شاہ ولی اللہ مرحوم کو جو عین محمد بن عبدالوہاب النجدی کے ظہور و شیوع عقائد کے زمانے میں حرمین میں مقیم تھے اس کی کتاب التوحید ملی۔ اور اسکی وجہ سے ان کے خیالات میں بھی یک گونہ فتور ہوا اور اس فتنے کو اپنے ہمراہ ہندوستان لائے ان کی کتابوں میں مولوی اسمٰعیل کو کتاب التوحید ملی" (کہانی ص ۳۶)

یہ عظیم ترین بہتان بھی مولانا خیرالدین کے "حقائق و معارف" کا ایک نمونہ اور ان خیالات کی ایک جھلک ہے جو حضرت شاہ ولی اللہؒ سے متعلق وہ رکھتے تھے ـــــ غور تو کیجیے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے قیام حرمین کا زمانہ ۱۱۴۳ھ سے ۱۱۴۵ھ تک کا ہے ۱۱۷۶ھ میں ان کا وصال ہو گیا اور مولوی فضل رسول بدایونی جو مولانا خیرالدین کے معتمد علیہ اور "مولانا اسمٰعیل دشمنی" میں ان کے خاص ہم مشرب و ہم مزاج ہیں سیف الجبار میں یہ ارقام فرما رہے ہیں کہ کتاب التوحید ۱۲۲۱ھ میں اواخر ایام سلطان سلیم ثالث میں مکہ معظمہ کے اندر آئی تھی۔ پھر قیام حرمین کے زمانے میں یہ کتاب حضرت شاہ ولی اللہؒ

مولانا خیرالدین کا سفر عراق "انھوں نے عراق کا سفر کیا اور چھ سات ماہ ٹھہرے اس زمانہ میں شیخ عبدالرحمٰن نقیب الاشراف تھے، ان کے یہاں مہمان ہوئے، اُن سے طریقۂ قادریہ کی اجازت لی اور انھوں نے اُن سے طریقۂ نقشبندیہ کی" (کہانی ص۱۸)

مولانا آزاد نے مولانا حبیب الرحمٰن شروانی مرحوم کے نام ایک مکتوب میں لکھا ہے:۔

"والد مرحوم جب ۱۲۹۱ھ میں عراق گئے تھے تو سید عبدالرحمٰن نقیب مرحوم کے والد سید علی رحمۃ اللہ علیہ سجادہ نشین تھے اُن ہی کے یہاں ٹھہرے" (کاروان خیال ص۵)

معلوم نہیں ان دونوں باتوں میں کون سی بات صحیح ہے، آیا وہ شیخ عبدالرحمٰن نقیب الاشراف کے زمانے میں عراق گئے تھے یا سید علی کے زمانے میں؟ ۔

پوری کتاب سے یہ بھی معلوم نہ ہوسکا کہ مولانا خیرالدین سلسلۂ نقشبندیہ میں کس بزرگ سے بیعت تھے؟ اور یہ بھی تعجب ہے کہ مولانا خیرالدین نے صاحب روح المعانی پر حیات و ممات خضر کے مسئلے میں اعتراض کرتے وقت یہ غور نہ فرمایا کہ سلسلۂ نقشبندیہ کے ایک بلند پایہ صاحب علم ظاہری وباطنی بزرگ حضرت خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ خود حیات خضر کے قائل نہیں ہیں؟ مکتوبات معصومیہ میں اُن کا مکتوب اور اُسکے دلائل ملاحظہ فرما لیتے تو پھر شاید اس مسئلہ پر قلم اُٹھانے کی ہمت نہ فرماتے۔

مولانا آزاد کا سفر عراق و حجاز مولانا کے بھائی کے تذکرے میں ہے کہ:۔

"بلاد اسلامیہ کی سیاحت کا اُن کو بہت شوق تھا، چنانچہ اسی سلسلے میں جب ایک ساتھی یعنی حافظ عبدالرحمٰن امرتسری مل گئے تو انھوں نے عراق کا ارادہ کیا۔ عراق ہم دونوں ساتھ گئے لیکن میں وہاں پہنچ کر سخت بیمار ہوگیا اور واپس چلا آیا" (کہانی ص۱۷۹)

اس موقع پر سن روانگی نہیں بیان کیا گیا لیکن ص۳۱۱ پر ہے:۔

"۱۹۰۴ء میں ایسے حالات پیش آئے کہ میں عراق چلا گیا اور پھر کوئی نمبر لسان الصدق کا نہیں نکلا وہاں سے واپس آیا تو مولانا شبلی مرحوم سے ملاقات ہوئی یہ پہلی ملاقات تھی۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سفر ۱۹۰۴ء میں اپنے برادر بزرگ کی معیت میں ہوا۔ مولانا واپس آگئے اور وہ وہیں رہے اور اواخر ۱۹۰۶ء میں وہ صاحب فراش ہوکر واپس آئے حتیٰ کہ اوائل ۱۹۰۷ء میں کلکتہ میں ان کا انتقال ہوگیا، گویا وہ تقریباً تین سال بلاد اسلامیہ کی سیاحت میں مصروف رہے ـــ مولانا وسط

میں ہوائی حملے کئے ہی تھے اور آگے بڑھ کر اپنے فرضی استاد حضرت شاہ عبدالعزیزؒ پر بھی ہاتھ صاف کیا تھا اور انکی تفسیر اور اُن کے فتوی کو عالم خیال میں مضبوط دلائل سے رد کر دیا تھا ــــ اب ان کے نواسے مولانا خیرالدین کا زمانہ آیا تو انھوں نے باوجود اس ادعا کے کہ وہ خاندان ولی اللٰہی سے رشتہ تلمذ رکھتے ہیں شاہ عبدالعزیزؒ کا رد بقول مولانا آزاد (بروایت کہانی) "سو تفسیروں" کے حوالوں سے ما اھل بہ لغیر اللہ کے مسئلے میں کیا اور جب اس سے بھی تسکین خاطر نہ ہوئی تو صاحب حجۃ اللہ البالغہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کو اوّل محمد بن عبدالوہاب کی کتاب التوحید کا خوشہ چیں بتایا اور پھر معتزلی بنا کے چھوڑا ــــ اور کتنے مقدس انداز میں اپنے دل کی بات شاہ فخرالدین کی زبان سے شاہ عبدالعزیز کے کان میں چپکے سے کہلوا دی ــــ شاہ فخرالدین نے چپکے سے جو بات شاہ صاحب کے کان میں کہی تھی وہ مولانا خیرالدین کو غالباً مولانا منورالدین کے واسطے سے معلوم ہوئی ہوگی ــــ مولانا منورالدین ہی ایک ایسی نادر روزگار شخصیت ہیں جو اپنے استاد شاہ عبدالعزیز کی دستاربندی کے وقت بھی موجود ہو سکتے ہیں ــــ

میں پوری بصیرت کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ دستاربندی کی داستان محض بے اصل ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی سجادہ نشینی کی کوئی تقریب نہیں ہوئی جس میں حضرت شاہ فخرالدین چشتی نے دستار باندھی ہو اگر ایسا ہوتا تو شاہ عبدالعزیزؒ اپنے ملفوظات میں اس کا ذکر فرماتے، کوئی تذکرہ نویس لکھتا، خود شاہ فخرالدین کے ملفوظات میں اس کا ذکر ہوتا ــــ علاوہ ازیں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اپنے والد ماجد کی حیات ہی میں فارغ التحصیل ہو کر منازل سلوک طے کر چکے تھے، وہ عملاً اپنے والد کے جانشین ان کی زندگی ہی میں ہو چکے تھے، پھر کیا ضرورت تھی جشن سجادہ نشینی منعقد کرنے اور شاہ فخرالدینؒ سے ایسی بات سننے کی؟ ــــ اور کمال یہ کہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنے باکمال باپ پر جو استاد اور پیر و مرشد بھی تھا اور جس سے غایت درجہ تعلق تھا، جیسا کہ شاہ عبدالعزیز صاحب کی تحریروں سے ظاہر ہے ــــ اتنا بڑا بہتان سنا اور وہ چیں بہ جبیں نہ ہوئے ــــ

اس قسم کی باتوں سے کہانی بھری پڑی ہے ــــ مولانا خیرالدین جن کو ایک پاکباز اور تقدس مآب کی حیثیت سے بار بار پیش کیا گیا ہے۔ انھوں نے وہابیوں، اسماعیلیوں، اور اسحاقیوں کو تمام عمر جو کوری کوری سنائی ہیں اس سے تو کتاب کا بڑا حصہ لبریز ہے۔

پونا چلے گئے اور وہیں قیام تھا کہ والد کی شدید علالت کا ایک تار سے علم ہوا اور کلکتے چلے گئے جس روز پہونچے اس کے چند گھنٹے بعد والد ماجد کا انتقال ہوگیا (دسمبر ۱۹۰۸ء میں) دیکھئے آزاد کی کہانی ص ۳۲۱ تا ۳۲۵

ان تمام تحریروں سے ثابت ہوا کہ ۱۹۰۴ء سے ۱۹۰۸ء تک مولانا کا قیام مسلسل ہندستان میں رہا اور وہ ہندستان سے باہر کہیں نہیں گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا کے بڑے بھائی ۱۹۰۲ء میں اپنے والد کے ساتھ دوبارہ حجاز چلے گئے تھے اور مولانا جنھیں گھر کی زندگی سے، کئی سال پہلے دل برداشتگی ہوگئی تھی بعد اب تک باقی تھی (ص ۳۱۳) مبئی ہی میں مقیم رہے اور لسان الصدق نکالتے رہے۔ بڑے بھائی والد کے ساتھ (جو اواخر ۱۹۰۴ء میں حجاز سے واپس آئے تھے ص ۱۴۴) واپس آگئے اور دسمبر ۱۹۰۴ء میں مولانا کے ساتھ لکھنؤ کانفرنس میں شرکت کی۔ مولانا اس کے بعد الندوہ سے متعلق ہوگئے اور پھر وکیل سے ۱۹۰۶ء میں جب مولانا وکیل میں تھے ان کے بھائی تنہا عراق و بلاد اسلامیہ کی سیاحت کی غرض سے گئے اور وہاں سے جو خطوط بھیجتے تھے وہ "وطن" امرت سر میں برابر شائع ہوتے رہتے تھے (ص ۱۴۸) ــــ مولانا کا ان پانچ سال ۱۹۰۴ تا ۱۹۰۸ء میں عراق کا سفر کسی طرح صحیح نہیں۔

کہانی میں سفر عراق ۱۹۰۴ء میں بتایا گیا ہے لیکن کاروان خیال کے جس خط میں سفر عراق کا ذکر فرماتے ہیں اس وقت اپنی عمر ۲۰-۲۱ سال کی بتائی ہے اور یہ وہ زمانہ ہے جب کہ شک و انکار کے بعد یقین و اعتقاد کا حصول، عقلیت و الحاد کے بعد حقیقت کی روشنی نمودار ہو چکی تھی (ص ۲۶۱)، تو یہ زمانہ ۱۹۰۹ء کا ہوتا ہے اور اس وقت اُن کے بڑے بھائی وفات پا چکے تھے۔ مولانا کا قیام والد کی وفات سے پہلے اور اس کے بعد اجراء الہلال ۱۹۱۲ء تک مسلسل و غیر منقطع طور پر ہندستان ہی میں رہا۔ لہٰذا اس زمانہ میں بھی جیسا کہ مذکورہ بالا حوالجات سے ثابت ہے یہ سفر نہیں ہو سکتا ــــ

کہانی میں عراق کا جانا بھائی کی معیت میں بتایا گیا ہے لیکن مولانا نے اپنے مکتوب کاروان خیال میں جو کوائف تحریر فرمائے ہیں اس میں کہیں بھائی کی موجودگی کا تذکرہ بھی نہیں اور یہ ممکن نہ تھا کہ دونوں بھائی ساتھ ہوں اور چھوٹے بھائی کی تو علماء واکابر عراق پذیرائی کریں اور بڑے بھائی کو جو کسی لحاظ سے بھی اُن سے کم نہ تھے پوچھیں تک بھی نہیں ــــ نیز ۱۹۰۴ء میں

۱۹۰۴ء میں واپس آگئے تھے۔ اسی زمانے میں مولانا شبلی سے اُن کی پہلی ملاقات ہوئی اور مولانا نے انھیں حیدرآباد آنے کی دعوت دی اور الندوہ سے ان کے تعلق پر اصرار کیا۔ چنانچہ کہانی میں ہے:-

"دو تین ہفتے بعد وہ حیدرآباد چلے گئے اور وہاں سے برابر خطوط بھیجتے رہے کہ میں حیدرآباد آؤں" (ص ۳۱۳)

ص ۳۱۴ پر الندوہ کی ادارت کے سلسلے میں ہے:-

"یہ ٹھیک اس وقت کی بات ہے کہ دسمبر کا آخری ہفتہ تھا اور لکھنؤ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس تھا۔ میں اور بھائی مرحوم اس کی شرکت کی غرض سے لکھنؤ پہونچے تھے اور وہیں مولانا کا خط مجھے ملا تھا"

کانفرنس کا یہ اجلاس لکھنؤ میں دسمبر ۱۹۰۴ء میں منعقد ہوا تھا جس میں مولانا نے اپنے بھائی مرحوم کے ساتھ شرکت کی ـــــ اس سے یہ ثابت ہوگیا کہ ان کے بھائی دسمبر ۱۹۰۴ء میں ہندستان میں موجود تھے پھر ۱۹۰۴ء میں اُن کی معیت میں عراق کا سفر کس طرح ہوسکتا ہے؟ دونوں بھائیوں کی دسمبر ۱۹۰۴ء میں کانفرنس میں شرکت کی تائید مولانا ضیاء الحسن علوی ندوی مرحوم کے ایک مضمون سے بھی ہوتی ہے جو الندوہ ۱۹۱۲ء میں ان دونوں بھائیوں کی لکھنؤ میں ملاقات کے متعلق شائع ہوا ہے۔ لکھنؤ سے واپسی پر مولانا چند ماہ بمبئی میں رہے اور لکھنؤ نہ جاسکے، لیکن آخرکار

"اس مرتبہ میں نے قطعی فیصلہ کرلیا اور لکھنؤ پہنچ گیا ..... اور الندوہ کی ایڈیٹری انھوں نے میرے متعلق کردی، تقریباً سات آٹھ مہینہ وہاں قیام رہا"۔ (ص ۳۱۴)

(جولائی ۱۹۰۵ء لغایت فروری ۱۹۰۶ء)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کا قیام ۱۹۰۴ء سے اوائل ۱۹۰۶ء تک بمبئی اور لکھنؤ میں رہا۔ مارچ ۱۹۰۶ء میں پھر بمبئی گئے اور لاہور میں انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے معاً بعد جو اپریل ۱۹۰۶ء میں منعقد ہوا تھا وکیل کی ادارت سنبھالی اور اپنے بھائی کے انتقال تک امرتسر میں رہے۔ بھائی کے انتقال کی خبر معلوم ہونے پر (اوائل ۱۹۰۷ء میں) ادارت وکیل چھوڑکر کلکتہ چلے گئے اور چند ماہ قیام کے بعد پھر امرتسر واپس آئے اور دوبارہ وکیل کے فرائض ادارت انجام دیے۔ جون ۱۹۰۸ء تک امرتسر رہے۔ پھر ترک تعلق کرکے بھوپال آگئے۔ جولائی ۱۹۰۸ء میں

اور شیخ عبدالقادر سے ندوۃ العلما کے جلسہ کے موقع پر ملاقات ہو چکی تھی[۱] ــــ غالباً اسی اجلاس انجمن لاہور میں جو ندوہ کے اجلاس کلکتہ کے بعد ہوا اُن کی مولانا حالی سے بھی ملاقات ہوئی ہوگی۔ جیسا کہ ان کی زبانی بیان کیا گیا ہے ــــ "انجمن میں دوسرے سال پھر گیا اور تقریر کی (یعنی ۱۹۰۲ء کے اجلاس انجمن کے بعد ۱۹۰۳ء میں) مولانا حالی مرحوم سے ملاقات کا حال پہلے کہہ چکا ہوں جو اس سے پہلے سفر میں (یعنی ۱۹۰۲ء کے سفر میں حاصل ہوئی تھی"[۲]

بہرحال ہندوستان کے اسفار، اخبار و رسائل کے اجراء اور ان کی تقدیم و تاخیر ظاہر کرنے کے لئے بیشتر تو سنین کا تذکرہ ہی نہیں اور اگر ہے تو وہ تضاد و تناقض سے خالی نہیں[۳]۔

(۱) کہانی ص۳۳۲ (۲) کہانی ص۳۳۳ (۳) اس آخری عنوان کا کُل مضمون مولانا حکیم سید حسن مثنیٰ صاحب رضوی کے رشحات قلم کا نتیجہ ہے۔ (فریدی)

(حاشیہ متعلقہ صفحہ ۱۹)

مولانا حکیم سید حسن مثنیٰ صاحب رضوی ان گمنام اہل علم اور ارباب فکر و نظر میں سے ہیں جو اپنی خداداد ذہانت ذوق صحیح، وسیع مطالعہ اور سلامت فکر کے لحاظ سے بڑے بلند مقام کے حامل ہیں لیکن اپنی گوشہ نشینی اور خاموشی کی وجہ سے بہت کم معروف ہیں۔ مولانا کا دادھیال امروہہ کا مشہور رضوی سادات کا خاندان ہے اور ننھیال خانوادہ سید احمد شہیدؒ ہے۔ ان کے دادا مولانا حکیم علی حسن صاحب نامور طبیب حضرت مفتی صدر الدین خاں صاحبؒ کے شاگرد رشید تھے اور نواب صدیق حسن خاں وغیرہ کے ہم سبق تھے بیعت کا تعلق حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادیؒ سے تھا ــــ مولانا کے والد حکیم سید عزیز الرحمٰن صاحب امروہی بڑے حاذق طبیب اور بڑے ذہین تھے ــــ حکیم حسن مثنیٰ صاحب نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم پائی۔ ان کو حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندویؒ سے بھی تلمذ کا شرف حاصل ہے۔ تاریخ و انساب پر ان کی بڑی وسیع اور گہری نظر ہے اور کم لوگ اس موضوع پر ان کے پایہ کے ہیں۔ عربی اور اُردو ادب اور شعر و سخن کا بھی بڑا بلند اور پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں۔ اپنے بعض عوارض اور امراض کی وجہ سے وہ عرصہ سے گوشہ گیر ہیں۔ اگر وہ تصنیف و تالیف کا کام کرتے تو ہندوستان کے صف اول کے مصنفین میں ان کا شمار ہوتا۔

:: ::

مولانا شک و انکار کے دور میں تھے، پھر اس وقت علامہ نعمان آلوسی زادہ کا "من این اخذت هذا المشرب" کہنا کیا معنی رکھتا ہے۔

ان مسلسل واقعات کی روشنی میں جو مولانا کی اس کہانی میں موجود ہیں عراق کا سفر تنہا یا بھائی کی معیت میں ۴ء میں یا اس کے بعد ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔ اسی طرح ۵ء میں سفر حجاز کا جو ذکر کیا گیا ہے وہ بھی صحیح معلوم نہیں ہوتا جب کہ دسمبر ۴ء لغایت اپریل ۶ء مولانا کا قیام مسلسل بمبئی اور لکھنؤ رہا۔ ۵ء کا حج ۱۴۔ فروری ۵ء میں اور ۶ء کا ۴۔ فروری ۶ء میں ہوا۔ اور اس زمانے میں بھی مولانا الندوہ کے ایڈیٹر اور لکھنؤ میں قیام پذیر تھے۔ پھر یہ سفر کس طرح ۵ء میں ہو سکتا ہے۔

الغرض مولانا کی زندگی کے مسلسل واقعات سے یہ امر ثابت اور ناقابل بطلان ہے کہ وہ [illegible] میں (جب کہ ان کی عمر سات سال کی تھی) ہندستان آنے کے بعد ۱۹۵۱ء تک ہندستان سے کہیں باہر نہیں گئے ـــــ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم جن کے مولانا سے پچاس سال تک برابر تعلقات رہے۔ علمی و سیاسی معیت و رفاقت بھی برابر رہی۔ الہلال میں بھی کچھ عرصہ بحیثیت رفیق و معین کار، مولانا کی اعانت فرمائی اور جو مولانا کی نجی زندگی، مشاغل، گھریلو حالات اور سفر و حضر کے واقعات سے پورے پورے واقف تھے، ایک موقع پر تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"مولانا جب سے وادی غیر ذی زرع سے ہندستان آئے پھر کبھی ہندستان سے باہر نہیں گئے۔"[1]

اسی طرح ۱۹۰۴ء میں لاہور کا سفر ـــــ انجمن حمایت الاسلام کے اجلاس میں شرکت، مولانا حالی سے ملاقات بحیثیت مدیر لسان الصدق تعارف بھی کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ لسان الصدق کا اجراء ۲ء میں ندوہ کے اجلاس کلکتہ کے بعد ہوا ہے اور ندوہ کا یہ اجلاس اواخر ۱۹۰۳ء میں منعقد ہوا تھا ـــــ تو پھر جب ۱۹۰۳ء میں لسان الصدق جاری نہیں ہوا تو اس کے ایڈیٹر کی حیثیت سے تعارف اور مولانا حالی کا استعجاب کیونکر صحیح ہو سکتا ہے ـــ غالباً اس موقع پر ضبط متن میں تسامح ہوا ہے ص۳۳ پر "انجمن حمایت الاسلام میں لکچر" کے عنوان سے جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سفر مارچ ۲ء میں ہوا۔ مولانا نے ندوہ کے اجلاس کلکتہ کے بعد لاہور پہنچنے سے پہلے شیخ عبدالقادر کو خط لکھ دیا تھا

---

[1] آزاد کی کہانی صفحہ ۳۰۰ و ۳۰۹

تعارف و تبصرہ

صدیق اکبرؓ (گزشتہ سے پیوستہ)

اب ہم بعض جزئیات کی طرف آتے ہیں

(۱) ص۳۶ اور ص۳۷ پر لَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللهِ سَبَقَ الآیہ کے بارے میں عتاب کا سبب بیان کرنے میں جو مشہور روایت سے اختلاف کیا گیا ہے وہاں مصنف کا بیان بہت تشنہ رہ گیا ہے۔ مسلم کی حدیث سے معلوم نہیں ہوتا کہ اس سے مشہور قول کی تردید کس طرح ہوتی ہے اس کی کچھ وضاحت ہونی تھی

(۲) ص۵۸ پر حضرت علیؓ کی ایک بات کے بارے میں جو لکھا گیا ہے کہ "یہ وہی بات ہے جس کو ارباب معانی کی زبان میں نکتہ بعد الوقوع کہتے ہیں"۔ اگر ہماری کور ذوقی نہیں ہے تو ہم نہیں سمجھ سکے کہ ایک ادب شناس صحابہؓ کے قلم سے یہ فقرہ کیسے نکل سکتا ہے، یہاں ہمیں اس کتاب کے مقدمہ کے ص۱۲ کے یہ الفاظ یاد آرہے ہیں کہ "یہ چیز (جو حضرت علیؓ کی طرف منسوب کی جارہی ہے) حضرت علیؓ کی بے نفس اور پاکباز و پاک طینت شخصیت کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے؟"

(۳) ص۸۶ پر مسند احمد کی روایت سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی زبان سے حدیث سننے کے بعد حضرت سعد بن عبادہؓ نے (سقیفہ میں) حضرت ابوبکرؓ سے بخوشی بیعت کرلی تھی لیکن بخاری کی جو روایت (حضرت عمرؓ کے خطبہ کی) اس واقعہ کے سلسلے میں ص۹۴ اور ص۹۵ پر درج کی گئی ہے، مولانا نے غور نہیں فرمایا کہ اس میں اور اس میں تضاد ہے۔ سعد بن عبادہؓ ہی اگر سب سے پہلے بیعت کرلیتے تو پھر دیگر انصار کو اختلاف ہی کیوں رہتا۔ اور بیعت ابی بکرؓ کی نوعیت فلتۃً کی کیوں رہتی؟

(۴) ص۱۰۸ پر حدیث الائمۃ من قریش کے بارے میں مولانا نے خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ نہ خبر ہے



غور فرمائیں کہ اعتبار کن لوگوں کے محرکات کا ہوتا ہے، سربراہ اور اولوالامر کے محرکات کا یا عام فوجیوں کی کچھ تعداد کے محرکات کا؟ ظاہر ہے کہ ہمیں اس میں تو شبہ نہیں ہوسکتا کہ ابوبکر صدیقؓ آپ کے ماتحت قائدین اور راسخ الایمان مسلمانوں کے حق میں تو جنگ کا محرک صرف رضائے الٰہی اور غلبۂ اسلام تھا، غیر تربیت یافتہ قبائل اور نومسلم افراد کی شرکت جہاد کے محرک معاشی وجوہ ہوں تو ہوا کریں۔ حضرت خالد کی ایک تقریر کا جو اقتباس مولانا نے اس موقع پر مغربی مصنفین کی تائید میں پیش کیا ہے (ص۲۹۴ و ص۲۹۵) اس سے خود اس کا عکس ثابت ہوتا ہے جو مولانا ان مصنفین کی تائید میں ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت خالدؓ تو یہ فرما رہے ہیں کہ اگر ہمارا مقصد رضائے الٰہی نہ ہوتا تو صرف معاشی نقطۂ نظر سے بھی اس جہاد میں نفع ہی نفع تھا۔ کیا اس پیرایہ میں معاشی نقطۂ نظر کا تذکرہ بھی اس قابل ہے کہ اس سے مغربی مصنفین کی تائید حاصل کی جائے؟

(۹) ص۳۱۲ پر "انتم اعلم بامور دنیاکم" الحدیث سے استدلال بالکل سمجھ میں نہیں آیا اس کا محمل حقوق العباد یا دوسرے امور دنیا تو قطعاً نہیں ہیں جن کی بات ہو رہی ہے۔

(۱۰) ص۳۳۴ پر مجاعہ کی لڑکی سے حضرت خالد کا نکاح اور اس پر حضرت ابوبکر کا تہدیدی خط پڑھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت خالد کی سیرت کے اس پہلو کی صفائی بڑی ضروری تھی جو بار بار سامنے آتا ہے اور یقیناً بعض ناظرین پر برا اثر چھوڑے گا۔ ہرچند کہ "سیرت خالد" نہیں ہے "سیرت صدیقؓ" ہے تاہم یہ بات ضروری معلوم ہوتی ہے۔

(۱۱) ص۳۴۷ پر مولانا نے زکوٰۃ کو "اسٹیٹ ڈیوٹی" قرار دیا ہے مگر ایک طالب علم کو یہ سوال پریشان کرتا ہے کہ جب اسٹیٹ قائم نہ رہے تو پھر یہ ڈیوٹی کیونکر قائم رہ جاتی ہے۔ اچھا ہوتا اگر مولانا اس کی وضاحت فرما دیتے۔

تبصرہ ضرورت سے زیادہ پھیل گیا اور چند باتیں پھر بھی رہ گئیں۔ اب آخر میں بس مختصراً یہ عرض ہے کہ تبصرہ کے آخری حصہ سے ناظرین کو کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ اس قسم کی جزئیات تو ہر انسان کی تصنیف میں نکل آتی ہیں۔ مجموعی طور پر کتاب کی افادیت کے سامنے ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ مولانا اکبرآبادی کی یہ کتاب انشاء اللہ زندہ رہے گی۔

نہ انشاء ہمارے خیال میں "ما اقاموا الدین" وغیرہ الفاظ جو آگے آتے ہیں ان کے ساتھ مولانا کا بیان کردہ مطلب جوڑ نہیں کھاتا۔ ان الفاظ کے مفہوم کے ساتھ تو خبر یا انشاء ہی کی صورت جوڑ کھاتی ہے، واضح رہے کہ انشاء ماننے سے بعض وجوہ سے ہمیں خود انکار ہے۔

(۵) مالک ابن نویرہ کے قتل کے سلسلہ میں تو مصنف کی بحث سے حضرت خالدؓ کی پوزیشن بڑی حد تک صاف اور بے داغ ہو جاتی ہے۔ مگر مالک کی بیوی سے نکاح کے بارے میں بحث تشفی بخش نہیں ثابت ہوتی۔ خصوصاً اس مسئلہ کی صفائی کا یہ انداز کہ

"اُم تمیم نے فوراً ہی اسلام قبول کر لیا ہوگا" ص۲۰۸

یہ تو بالکل غیر تاریخی انداز ہے، اس طرح کی قیاس آرائیاں تو مسئلہ کو صاف نہیں کر سکتیں۔ پھر اس ذیل کی یہ بات بھی اُلجھنے کا باعث ہے کہ قتل و نکاح کے معاملہ میں نہایت پُرزور اور باوثوق صفائی کرنے کے بعد مولانا نے ص۲۱۱ پر حضرت خالدؓ کے ان دونوں افعال کو بے احتیاطی بھی قرار دے دیا ہے اور اس طرح قتل مالک کی دیت کا مسئلہ سُلجھانے کی کوشش کی ہے۔

(۶) ص۲۶۳ لغایۃ ص۲۶۲ پر قیصر کی جنگی تیاریوں کا جو ذکر کیا گیا ہے یہ بڑی کام کی چیز ہے مگر اس کے لئے کوئی حوالہ نہیں دیا گیا۔ حوالہ کی ضرورت تھی۔

(۷) ص۲۶۲ پر شام پر حملہ کے سلسلہ میں ذکر کیا گیا ہے کہ ماہ صفر میں حضرت ابوبکرؓ نے ایک مجلس مشاورت بُلائی اور ص۲۶۷ پر بلاذری کی روایت نقل کی گئی ہے کہ یکم صفر کو لشکروں کی روانگی عمل میں آ گئی، اس تناقض کو دور کرنے کی ضرورت تھی۔

(۸) ص۲۹۰ نے فتوحات کے اسباب" کے تحت مغربی مصنفین کے خیالات نقل کرتے ہوئے ص۲۹۱ پر اُن کی جزوی صداقت کا اقرار کرتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے کہ مسلمان مصنفین اور خاص طور پر قدیم طرز تعلیم کے لوگوں کا خاصہ ہے کہ کوئی مغربی مصنف مسلمانوں کی غیر معمولی کامیابی میں کسی اقتصادی اور معاشی وجہ کو دخیل بتاتا ہے تو وہ چڑھ سے جاتے ہیں۔۔۔ ہم ادب سے عرض کریں گے کہ مولانا چڑھنے کی پوری بات ہے ایک تو جو چیز زیادہ سے زیادہ محرک جنگ کہلائی جا سکتی ہے اس کو سبب فتح و کامرانی کہا جا رہا ہے۔ دوسرے محرک جنگ کی بات بھی یہ ہے کہ مغربی مصنفین تو جو چاہیں کہیں مگر آپ تو

ALFURQAN (Regd. No. A-353) LUCKNOW.